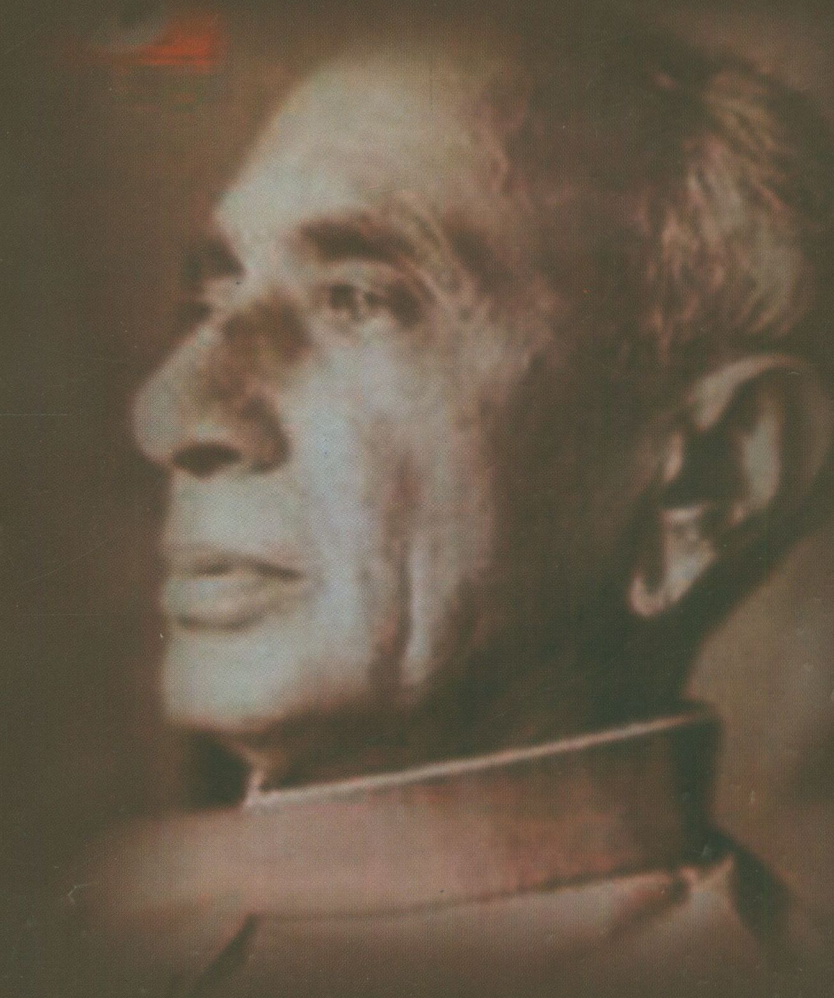
فکرِ جی۔ ایم۔ سید
اور
آج کا پاکستان



عبدالخالق جونیجو

فکرِ جی۔ ایم۔ سید

اور آج کا پاکستان



عبدالخالق جونیجو

سندھ بکس کراچی

کتاب کا نام: فکرِ جی۔ایم سید اور آج کا پاکستان

ترتیب: عبدالخالق جونیجو

اشاعت اول: 2011

اشاعت دوم: 17 جنوری 2016

طباعت: سندھ بکس کراچی

C-4, Sachal Goth Gulshan-e-Iqbal Karach, SINDH.
Ph# 021-3262413, 34690389
Cell: 0333-2:31182

Rs. 120/=

انتساب

سیکولرازم کے نام

فہرست

پیش لفظ

یہ صرف اصطلاحی جملہ نہیں بلکہ ایک نا قابل تردید عملی حقیقت ہے کہ جی ایم سید نے ہوش سنبھالتے ہی جدوجہد کی اور جب تک ہوش میں رہے جدوجہد کرتے رہے۔ 15 سال کی عمر میں انہوں نے تحریک خلافت سے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا اور جدوجہد کرتے کرتے 92 سال کی عمر میں نظر بندی کی حالت میں بیمار ہوئے، سرکاری سنگینوں کے سائے میں ہی اسپتال داخل ہوئے جہاں بے ہوش ہو گئے۔ سرکار نے باہر علاج کی اجازت نہیں دی اور اس طرح وہ ایک ہی وقت میں موت سے اور وقت کے حکمرانوں سے لڑائی لڑتے لڑتے چلے گئے۔ (یاد رہے کہ وہ حکومت جمہوریت کی چمپیئن بے نظیر بھٹو کی تھی)

جی ایم سید کی یہ جدوجہد بالا دست طبقوں، آمر حکمرانوں اور اسٹیٹسکو کی حامی قوتوں کے خلاف رہی۔ نتیجے میں یہ تمام قوتیں، تمام گروہ جی ایم سید کی مخالفت میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ پاکستان کی ریاست اور پاکستان کے سماج پر شروع سے ملا، ملٹری، جاگیردار کی بالا دستی رہی ہے اور جی ایم سید کے خلاف رہے ہیں۔ ریاست کی بات کی جائے تو اس کے تینوں ستون انتظامیہ، مقننہ

اور عدلیہ سید کو شکست دینے کی کوششوں میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار رہے۔اگر پریس کو چوتھا ستون سمجھا جائے تو وہ شاید سید دشمنی میں سب سے آگے ثابت ہو اس لئے اس کا ذکر الگ سے ہوگا۔حکمرانوں کو دیکھا جائے تو تمام فوجی چاہے سویلین ڈکٹیٹرز ، اسلامی یا شوشلسٹ، قدامت پسند یا لبرل، قائداعظم سے لیکر قائدعوام اور شیر پنجاب تک، سارے جی ایم سید کے خلاف متفق اور متحد تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تمام قوتیں یکجا ہو کر بھی سید کو شکست نہیں دے سکیں۔یہ تمام حکمران اپنی پوری طاقت کے ہوتے ہوئے بھی سید سے ڈرتے تھے جو کبھی کبھی تو بالکل یک وتنہا اُن کے سامنے سینہ سپر ہوتا تھا۔محمد علی جناح اپنی مقبولیت کے عروج کے وقت بھی جی ایم سید سے اتنا خوفزدہ تھا کہ ان کا سامنا کرنے کیلئے اُس کو پورے ہندوستان سے رضا کار بلانے پڑے۔اس کے باوجود سندھ کے اس محبّ وطن سپوت کو نہ ہرا سکا تو پاکستان کا اقتدار ملتے ہی جو پہلے نیک کام اس نے کئے ان میں جی ایم سید کو قید کرنا بھی شامل تھا۔1970 میں ذوالفقار علی بھٹو سندھ (اور پنجاب) کے انتخابی افق پر چھا گیا، جی ایم سید اپنی نشست بھی ہار گئے، بھٹو پاکستان کا میکاولین بادشاہ بن گیا۔خود کو تیسری دنیا اور اسلامی دنیا کا لیڈر سمجھتا تھا لیکن جی ایم سید سے اتنا خوفزدہ تھا کہ اپنے اقتدار کا ایک دن بھی سید کا آزاد حیثیت میں مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔جنرل ضیاء اپنی تمام تر فوجی طاقت اور رفقاء کی رفاقت کے باوجود جی ایم سید کو آزاد کرنے سے ڈرتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ آخر بغیر لشکر، بغیر خزانے کے، عدم تشدد کے پیروکار، کمزور جسمات والے جی ایم سید کی ایسی کونسی طاقت تھی جس سے یہ پوری ریاست اور یہ سارے حکمران ڈرتے تھے؟ جواب ہے ان کے خیالات تاریخی شعور پر مبنی، زمینی حقائق کے مطابق اور انسانیت کی محبت سے معمور خیالات۔جی ایم سید کی سچائی اور ان کے خیالات کی طاقت کا ثبوت یہ ہے کہ جن ریاستی اداروں اور حکمرانوں نے جن خیالات کی وجہ سے سید کو غدار کہہ کر قید و بند میں رکھا بعد میں ان ہی خیالات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔پاکستانی ریاست کی سید دشمنی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سید کہتے تھے کہ ملک کی ترقی اور انسانوں کی خوشحالی کیلئے ضروری تھا کہ مذہب کو ریاست سے الگ کیا جائے جبکہ حکمران ریاستی امور چلانے کیلئے مذہب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔لہذا انہوں نے جی ایم سید کو کافر، غدار، اسلام دشمن اور ملک دشمن کہا۔گزشتہ تین دھائیوں سے ہونیوالی

دھشتگردی، قتل و غارتگری اور تباہی و بربادی کے بعد اب حکمران یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ سیاسی اور سماجی معاملات میں مذہب کو استعمال نہ کیا جائے اور کوئی کسی کو کافر نہ کہے۔ اگر اس ریاست کے مہنداروں میں ذرا سی بھی سیاسی اخلاقیات ہے اور تھوڑی سی بھی حقیقت پسندی ہے تو انہیں اس طرح جی ایم سید سے معافی مانگنی چاہیئے جیسے پاپائے روم نے گیلیلو سے معافی مانگی تھی۔

بھٹو نے اقتدار کے نشے میں جی ایم سید کو قید میں ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ ''جی ایم سید سندھ کی آزادی کی بات کرتا ہے وہ غدار ہے۔ لہٰذا اس کو موت بھی قید میں آئیگی جبکہ جی ایم سید نے کہا کہ پنجاب والے بھٹو سے کام نکال کر اسے پھانسی دے دینگے۔ جب وقت بدلا اور بھٹو کو جیل میں موت قریب آتی نظر آئی تو اس نے کہا کہ ''جتنی خدمت میں نے پاکستان کی کی اتنی کوشش اگر سندھ کی آزادی کیلیئے کرتا تو آج یہ صورتحال نہ ہوتی'' (بھٹو کی جیل میں چوکیداری پر معمور کرنل کا ٹیلیویژن انٹرویو)۔ آجکل (2015) جب پاکستان کے عسکری اداروں نے پ۔پ۔ لیڈروں کے گلے پہ بوٹ رکھا ہوا ہے تو وہ صبح شام چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ ''پنجاب اور سندھ کیساتھ یکساں سلوک نہیں کیا جارہا، اور یہ کہ ''پنجاب میں دوسرا قانون اور سندھ میں دوسرا'' اب ان بیچاروں کو کون سمجھائے کہ جی ایم سید کی قومی حقوق کیلیئے جدوجہد کی بنیاد یہی تھی کہ ''اس ریاست میں پنجاب کی حیثیت دوسری (حاکم) اور سندھ کی دوسری (محکوم) ہے۔'' عسکری اداروں کیساتھ قربت کا فخریہ طور پر بار بار اعلان کرنے والا وزیر داخلہ چوہدری نثار پارلیمنٹ میں پالیسی بیان دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ''مذہبی انتہا پسندی ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے'' یہی چوہدری نثار تھا جب 1992ء مین بڑھتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی کے خطرات کی نشاندھی کرنے پر جی ایم سید کو اس کے خصوصی احکامات پر نظر بند کیا گیا تھا (نثار اس وقت وزیر اعظم کا خاص معاون تھا)۔ یہی نظر بندی تھی جو موت تک سید کیساتھ گئی۔ اب اگر پیپلز پارٹی کے لیڈروں (وزیر اعلیٰ قائم علی شاہ، سینئر وزیر نثار کھوڑو وغیرہ) اور چوہدری نثار کا ضمیر زندہ ہے اور ان میں تھوڑی بھی سیاسی سمجھ اور اخلاقی جرأت ہے تو انہیں چاہیئے کہ سن جائیں اور سید کی قبر سے جا کے معافی مانگیں۔

جی ایم سید اور پاکستان کے حکمرانوں کے درمیان اس جنگ (جس میں ایک طرف نئے خیالات تھے اور دوسری طرف نئے ہتھیار اور نئے قوانین) اور اس جنگ کے نتائج کی ایک

مختصر جھلک پاکستان کے عوام اور خواص کو دکھانے کی کوشش میں سنہ 2011ء میں یہ کتاب پبلش کی گئی تھی۔اس کے بعد سے صورتحال مزید واضح ہوئی ہے۔مذہبی انتہاپسندی سے پیدا ہونے والی دہشتگردی اس ملک کے 'جغرافیائی اور نظریاتی' محافظوں کے گھر تک پہنچ گئی اور ان کو اپنے ادارتی بائبل (گرین بوک) میں تبدیلی کر کے لکھنا پڑا کہ اب ملک کو سب سے بڑا خطرہ باہر سے نہیں بلکہ اندر سے (مذہبی دہشتگردی) ہے۔ملک کے باقی ادارے بھی یہی منترا دھرا رہے ہیں کہ مذہبی انتہاپسندی اور اس سے جنم لینے والی دہشتگردی پاکستان کیلئے وجودی خطرہ Existential Threat ہے۔

ان اداروں میں سب سے آگے میڈیا ہے اور یہ ہی میڈیا ہے جو آج تک مذہب کا نام لیکر روشن خیال لوگوں کے خلاف کفر کے فتوے اور غداری کے سرٹیفکیٹ جاری کرتا رہتا ہے۔خاص طور پر اردو میڈیا (جو خود کو غلط طور پر قومی میڈیا کہتا ہے) اس پروپیگنڈا اور کردارکشی کی مہم میں سب سے آگے رہا ہے اور اس کے فتوے بازی کے تیروں کا نشانہ سب سے زیادہ جی ایم سید رہے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ طاقت ور اداروں کی خوشنودی کی خطر میڈیا والے مذہبی انتہاپسندی کے خلاف تو لکھ اور بول رہے ہیں لیکن جی ایم سید کے خلاف بہتان بازی، الزام تراشی اور کردارکشی کا کوئی موقع ہاتھ سے آج بھی جانے نہیں دیتے۔ بلکہ خود کو بڑا ماہر اور معتبر سمجھنے والے صحافی حضرات تو ایسے موقع ڈھونڈنے اور اگر نہ ملے تو پیدا کرنے کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ایسے ہی ایک صحافی کا نام حامد میر ہے جو میڈیا کے جنگ گروپ سے وابستہ ہے۔اس نے 5 ستمبر 2015 کے جنگ میں ایک کالم لکھا جو جی ایم سید کے خلاف تعصب اور بغض کے زہر سے بھرپور اور تاریخی حقائق سے کوسوں دور تھا۔ میں نے درست حقائق کے ساتھ جواب لکھا لیکن نہ حامد میر میں اتنی ہمت ہوئی، نہ جنگ میں اتنی جرأت کہ میرا جواب چھاپتے۔میرا لیگل نوٹس پہنچنے کے بعد وہ یہ جواب چھاپنے پر مجبور ہوئے۔لیکن حامد میر کے تعصب اور سید دشمنی کی آگ ٹھنڈی ہونے کے بجائے مزید تیز ہوئی اور فرسٹریشن میں آ کر اس نے ایک اور کالم لکھا جس میں حقائق کی مزید بیخ کنی کرنے کے ساتھ ساتھ سائیں جی ایم سید اور میرے خلاف ذاتی الزام تراشی پر اتر آئے۔ میں نے اپنی صفائی میں تو کچھ نہ لکھا لیکن تاریخ کا ریکارڈ درست کرنے کی خاطر ایک اور جواب لکھ کر جنگ کو اور کالم نگار کو بھیجا لیکن آج تک وہ شائع نہیں ہوا ہے۔میرے وہ دونوں مضامین اس دوسرے اضافہ

شدہ ایڈیشن میں شامل کیے گئے ہیں۔

پہلے ایڈیشن کا دیباچہ لکھوانے کی غرض سے جب میں کتاب کا مسودہ ڈاکٹر سید جعفر احمد کے پاس لے گیا تو انہوں نے میری اس کوشش کو سراہتے ہوئے کہا کہ اردو میں جی ایم سید کا یا ان کے بارے میں لکھا مواد بہت کم ہے جبکہ ان کے خلاف سب سے زیادہ اردو میں لکھا گیا ہے نتیجہ کے طور پر اردو ریڈر کو جی ایم سید کے بارے میں یا تو معلومات ہے ہی نہیں یا اگر ہے تو وہ منفی اور حقائق کے برخلاف ہے۔انہوں نے ایسی کتاب کو وقت کی ضرورت قرار دیتے ہوئے یہ بھی مشورہ دیا کہ جی ایم سید کی زندگی کے بارے میں اردو دانوں کو معلومات ہی نہیں ہے لہذا ان کی زندگی کا مختصر خاکہ بھی شامل ہونا چاہیئے۔کتاب کے آخر میں جو مختصر سوانحی خاکہ ہے وہ ڈاکٹر صاحب کی تجویز پر شامل کیا گیا تھا۔

اردو زبان میں جی ایم سید کے بارے میں مواد کی کمی اور ضرورت کے حوالے سے ڈاکٹر جعفر احمد کی بات درست تھی۔ کتاب شائع ہونے کے دو سال کے اندر تمام کاپیاں ختم ہوگئیں۔2013ء سے میں نے کتاب کے پبلیشر اور فکشن ہاؤس کے مالک ظہور احمد خان کو کہنا شروع کیا کہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونا چاہیئے۔ ہر دفعہ وہ ہاں تو کردیتے لیکن پھر اگلی بات ہونے میں مہینوں لگ جاتے دراصل ان کا کاروبار بہت پھیل چکا ہے جس کو سنبھالنے میں وہ بہت مصروف رہتے ہیں اور ان کی اس مصروفیت کی وجہ سے ابھی تک بات وہیں ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ لہذا وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے اور مواد کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے ارادہ سندھ بکس کراچی کے سربراہ محترم سندھی انعام سے کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی گذارش کی جو انہوں نے بغیر کسی تحفظ کے قبول کرلی۔

اس کتاب کی ضرورت کیوں؟

جو حکمران بندوق کی طاقت پر انحصار کرتے ہیں اور بندوق کی گولی سے لوگوں کو ڈراتے ہیں وہ خود الفاظ کی طاقت سے ڈرتے ہیں، خاص کر کے الفاظ کے ساتھ آنے والے نئے خیالات سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کیونکہ حکمران مروجہ نظام کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اور ایسا وہ اس لئے کرتے ہیں کہ اس نظام کے ساتھ ان کے مستقل مفادات (Vested Interests) وابستہ ہوتے ہیں، جبکہ نئے خیالات، نئے نظام، نئی صبح کی نوید لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لئے بندوق اور خیالات سے تصادم اور اسلحے اور الفاظ میں جنگ ہمیشہ سے چلتی آئی ہے۔

پاکستان میں بھی یہ جنگ پہلے دن سے جاری ہے۔ اس میں ایک فریق وہ حکمران ہیں جن کو لاکھوں کی فوج اور اربوں کے اسلحے کی طاقت اور عدالتوں اور اسمبلیوں کی حمایت حاصل رہی ہے جبکہ دوسری طرف وہ چند سیاسی رہنما اور ادیب دانشور ہیں جن کے ہاتھوں میں چند روپوں والا قلم اور ساتھ میں نئے خیالات کی قوت ہے۔ ان میں سب سے اہم اور نمایاں نام جی۔ ایم۔ سیّد کا ہے۔ مختصر جسامت والا یہ شخص جس نے ہمیشہ عدم تشدد کی بات کی اور کبھی کوئی بندوق والا محافظ بھی اپنے ساتھ نہیں رکھا، نہ ہی لاکھوں لوگوں کے مجمعے اکٹھے کئے بلکہ کبھی کبھی تو وہ سیاست کے میدانِ جنگ میں اکیلا کھڑا رہا لیکن پھر بھی مسلمانوں کے سب سے بڑے ملک کے

حکمران سب سے زیادہ اُسی سے ڈرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں سب سے زیادہ تیس برس قید جی۔ایم۔سید نے کاٹی۔ وجہ؟ جی۔ایم۔سید کے خیالات اور ان خیالات کو اظہار کی قوت دینے والا قلم۔ سقراط کو بھی زہر کا پیالہ پلا کر ایتھنز کے حاکموں نے اس لئے موت کی نیند سُلا دیا کہ وہ اُس سے ڈرتے تھے، اور ڈرتے اس لئے تھے کہ وہ لوگوں میں نئے خیالات پھیلاتا تھا، خاص طور پر نئی نسل کے لوگوں میں، اور اس سے حکمرانوں کو اپنے اونچے محلات کے برج ہلتے محسوس ہوتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ جی۔ایم۔سید کے 'باغیانہ' خیالات کے مخاطب بھی اکثر نئی نسل ہی ہوتی تھی۔ سندھ کے انقلابی شاعر شیخ ایاز نے کہا:

مون ڏات انوکي آندي آ. تي تند وڙهي تلوارن سان!
ٽکرايان پنهنجا گيت جڏهن. تو آءُ سنڌءِ ديوارن سان.
تا تنهنجا ڀاري برج لڏن. تون هيڻو آن هٿيارن سان.
"شيخ اياز"

(میں دین انوکھی لایا ہوں، تار تلواروں سے لڑ رہی ہے، جب میں اپنے گیت تمہاری دیواروں سے ٹکراتا ہوں، تمہارے بھاری برج لرز اُٹھتے ہیں، ہتھیار ہونے کے باوجود تم کمزور ہو۔)

جی۔ایم۔سید کے خیالات سے پاکستان کی بھاری بھرکم ریاست کیسے اور کتنا ڈرتی تھی اس کا ایک نمونہ: 17 جنوری 1992ء جی۔ایم۔سید کی سالگرہ کا سالانہ جلسہ نشتر پارک کراچی میں منعقد ہوا۔ اس میں دوسری باتوں کے علاوہ سید نے سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد اقوام متحدہ کی نئے سرے سے تشکیل کے لئے تجاویز پیش کیں۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ دنیا میں کہیں سے ایسی تجاویز آئیں۔ دوسرے دن پاکستان کی مرکزی حکومت نے ان پر غداری کا مقدمہ داخل کر کے انہیں نظر بند کر دیا اور مقدمہ خصوصی عدالت میں بھیج دیا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ یہ خصوصی عدالتیں قائم ہی

حکومت کے مخالف لوگوں کو سزا دینے کے لئے کی جاتی ہیں۔ یہ بھی سب کو پتہ ہے کہ غداری کی سزا موت ہے۔ تو ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ حکومت تیزی سے کیس چلا کر ان کو سزا دلواتی۔ لیکن ہوا یہ کہ ساڑھے تین سال تک، جب تک وہ زندہ رہے، مقدمہ شروع ہی نہیں ہوا۔ مقدمہ شروع تو کجا ان کو عدالت میں پیش ہی نہیں کیا گیا۔ ہر پیشی پر حکومت کی طرف سے انہیں عدالت نہ لے جانے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ پیش کیا جاتا تھا، کبھی پولیس نفری کی کمی، کبھی امن امان کی صورتحال تو کبھی حکام کی مصروفیت وغیرہ جبکہ دوسری طرف ہر پیشی کے دن سید صبح سویرے تیار ہو کر بیٹھتے اور پولیس کا انتظار کرتے اور پیشی کے دن جتنا جی۔ایم۔سید خوش ہوتے تھے میں نے اپنی 25 سالہ قریبی رفاقت کے دوران بہت ہی کم مواقع پر انہیں اتنا خوش دیکھا۔ ساڑھے تین سالوں میں ایک دن ایسا آیا کہ پولیس آ گئی اور سائیں کی خصوصی عدالت کے لئے روانگی ہوئی۔ جیسے ہی یہ خبر امریکی قونصل خانے کے قریب قائم خصوصی عدالت میں پہنچی تو حکومت کا مقرر کردہ جج جس کی دراز میں وہ قانون اور ہاتھ میں وہ قلم تھا جس سے وہ جی۔ایم۔سید کو موت کی سزا دے سکتا تھا، وہ عدالت کو چھوڑ کر عملی طور پر پچھلے دروازے سے بھاگ گیا۔ جی۔ایم۔سید کے خوش ہونے اور ریاستی اداروں کے خوفزدہ ہونے کی وجہ ایک تھی: سب کو معلوم تھا کہ عدالت میں سید، سقراط کی سنت کو دہراتے ہوئے، اقبالِ جرم کریں گے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ حکمرانِ وقت (بندوق پر انحصار کرنے والے) مروجہ نظام کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ اسٹیٹس کو (Status quo) قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کا نیا ملک وجود میں آنے سے نیا نظام وجود میں نہیں آیا اور نہ ہی نئی ریاست کی تشکیل ہوئی۔ بس انگریز سے اقتدار مقامی لوگوں کو منتقل ہوا۔ باقی نظامِ حکومت وہی جاری رہا، طریقہ حکمرانی وہی اختیار کیا گیا۔ تو پاکستان بننے کے

حکومت کے مخالف لوگوں کو سزا دینے کے لئے کی جاتی ہیں۔ یہ بھی سب کو پتہ ہے کہ غداری کی سزا موت ہے۔ تو ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ حکومت تیزی سے کیس چلا کر ان کو سزا دلواتی۔ لیکن ہوا یہ کہ ساڑھے تین سال تک، جب تک وہ زندہ رہے، مقدمہ شروع ہی نہیں ہوا۔ مقدمہ شروع تو کجا ان کو عدالت میں پیش ہی نہیں کیا گیا۔ ہر پیشی پر حکومت کی طرف سے انہیں عدالت نہ لے جانے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ پیش کیا جاتا تھا، کبھی پولیس نفری کی کمی، کبھی امن امان کی صورتحال تو کبھی حکام کی مصروفیت وغیرہ جبکہ دوسری طرف ہر پیشی کے دن سید صبح سویرے تیار ہو کر بیٹھتے اور پولیس کا انتظار کرتے اور پیشی کے دن جتنا جی۔ایم۔سید خوش ہوتے تھے میں نے اپنی 25 سالہ قریبی رفاقت کے دوران بہت ہی کم مواقع پر انہیں اتنا خوش دیکھا۔ ساڑھے تین سالوں میں ایک دن ایسا آیا کہ پولیس آگئی اور سائیں کی خصوصی عدالت کے لئے روانگی ہوئی۔ جیسے ہی یہ خبر امریکی قونصل خانے کے قریب قائم خصوصی عدالت میں پہنچی تو حکومت کا مقرر کردہ جج جس کی دراز میں وہ قانون اور ہاتھ میں وہ قلم تھا جس سے وہ جی۔ایم۔سید کو موت کی سزا دے سکتا تھا، وہ عدالت کو چھوڑ کر عملی طور پر پچھلے دروازے سے بھاگ گیا۔ جی۔ایم۔سید کے خوش ہونے اور ریاستی اداروں کے خوفزدہ ہونے کی وجہ ایک تھی: سب کو معلوم تھا کہ عدالت میں سید، سقراط کی سنت کو دہراتے ہوئے، اقبالِ جرم کریں گے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ حکمرانِ وقت (بندوق پر انحصار کرنے والے) مروجہ نظام کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ اسٹیٹس کو (Status quo) قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کا نیا ملک وجود میں آنے سے نیا نظام وجود میں نہیں آیا اور نہ ہی نئی ریاست کی تشکیل ہوئی۔ بس انگریز سے اقتدار مقامی لوگوں کو منتقل ہوا۔ باقی نظامِ حکومت وہی جاری رہا، طریقہ حکمرانی وہی اختیار کیا گیا۔ تو پاکستان بننے کے

نمو نے استعمال کیا۔

اب اُس صورتحال کو بہت عرصہ گذر چکا ہے اور دریائے سندھ سے بہت سا پانی گذر کر بحیرہ سندھ میں گر چکا ہے۔ اب میڈیا کی بھی صورتحال مختلف ہے۔ اب میڈیا کی عوام تک اور عوام کی میڈیا تک رسائی ممکن ہے۔ اب حکمرانوں کی ''اسلام دوست''، ''عوام دوست'' اور ''پاکستان نواز'' پالیسیوں کے نتائج بھی سامنے آرہے ہیں تو جی۔ایم۔سید کے ''اسلام دشمن''، ''عوام دشمن'' اور ''پاکستان دشمن'' خیالات کو پرکھنے کے مواقع بھی۔ اس پس منظر میں میں نے اور فکشن ہاؤس کے ظہور احمد خان نے سوچا کہ جی۔ایم۔سیّد کے اُس وقت کے خیالات، خدشات اور امکانات کو آج کے حالات میں عام لوگوں تک پہنچایا جائے خاص کر کے ان لوگوں تک جو سندھی زبان پڑھ نہیں سکتے کیونکہ سیّد صاحب کی اکثر تحریریں ان کی اپنی مادری زبان سندھی میں ہی ہیں۔ یہاں ہم نے ان کی کچھ انگریزی تحریروں اور تقریروں کو اردو ترجمے کی شکل میں جمع کیا ہے۔ اس مختصر سی لیکن اہم کتاب میں ایک اہم وہ خطبہ استقبالیہ ہے جو جناب جی۔ایم۔سید نے 1948 میں بننے والی پاکستان پیپلز آرگنائزیشن کے اساسی کنونشن میں آئے مندوبین کو پیش کیا تھا۔ اس کنونشن میں برصغیر کے نامور ترقی پسند، روشن خیال اور قوم پرست شخصیات جیسا کہ خان عبدالغفار خان، عبدالصمد خان اچکزئی، شیخ عبدالمجید سندھی، شیخ ظہیرالدین اور منشی احمد دین شامل تھے۔ دوسرا پاکستان پیپلز آرگنائزیشن کا سیاسی پروگرام اور لائحہ عمل ہے جبکہ تیسرا 1952 میں آسٹریا کے دارالحکومت ویانا میں منعقدہ عالمی امن کانفرنس میں کی گئی سید کی تقریر ہے۔ اس کے ساتھ میرا ایک تجزیاتی مضمون ہے جو 17 جنوری 2011 کو ان کی سالگرہ کے موقعہ پر سندھی اخباروں میں چھپا تھا۔

اپنی زندگی کے آخری حصے میں خاص کر کے 1971 میں بنگلہ دیش کے قیام کے

بعد جی۔ایم۔سید کے کچھ خیالات میں تبدیلی آئی۔مثال کے طور پر اب پاکستان کی ریاست کو مضبوط بنانے کی بجائے آزاد، خودمختار اور خوشحال سندھ کا حصول ان کی جدوجہد کا اہم مرکز تھا۔ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا، یہ کتاب پڑھنے سے یہ 'معمہ' سمجھنے میں آسانی ہوگی، ان لوگوں کے لئے جو نیک خواہشات تو رکھتے ہیں لیکن معلومات کی غربت کے مارے ہوئے ہیں۔

جی۔ایم۔سید نے کئی مرتبہ کہا اور اپنی تحریروں میں لکھا کہ میری زندگی کا مقصد عالمی، امن، بھائی چارہ اور بنی نوع انسان کی ترقی ہے۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ یہ آدرش سندھی قوم کے ہزاروں برس کے تاریخی سفر کا ماحصل ہیں جو انہیں شاہ لطیف اور مخدوم بلاول جیسی شخصیات کی معرفت ورثے میں ملے ہیں۔پیپلز آرگنائزیشن کے قیام کے وقت ان کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اپنا یہ عالمگیر مقصد برصغیر کی معرفت حاصل کرنا چاہتے تھے۔اس لئے وہ چاہتے تھے کہ پاکستان ایک جمہوری، روشن خیال، سیکولر اور امن پسند ملک ہو جس کے تمام پڑوسیوں سے عمومی طور اور ہندوستان سے خصوصی طور پر دوستانہ تعلقات ہوں۔لیکن پاکستانی حکمرانوں کی جنگی جنون، انتہا پسندی، قومی و طبقاتی استحصال اور سامراج دوستی پر مبنی پالیسیاں جن کی انتہا بنگالی (مشرقی پاکستان) پر فوجی چڑھائی اور بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں ہوئی، ان کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ امن، محبت، بھائی چارے اور ترقی کے عالمگیر مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں سندھی قوم کے کردار ادا کرنے میں نفرت، تفریق اور تشدد کی داعی پاکستان کی ریاست رکاوٹ ہے، اور اُس کے سدھرنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔لہٰذا انہوں نے آزاد، خودمختار سندھ کے لئے جدوجہد کی جس کے لئے وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ یہ میری منزل نہیں بلکہ منزل کی طرف ایک اہم پیش رفت ہے۔

دوسری اہم بات اسی تقریر میں انہوں نے یہ کہی کہ عوام کو ان کے جمہوری حقوق اور ملکی معاملات میں بھرپور شراکت اور اختیارات دیئے جائیں ورنہ پھر غیر قانونی اور پُر تشدد تحریکوں سے بچنا مشکل ہوگا۔ اسی طرح قومی سوال کے حوالے سے حکمرانوں کو خبردار کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''پاکستان کو مکمل طور پر خود مختار سوشلسٹ جمہوریاؤں کا ایک وفاق بنانا چاہئے نہ کہ۔۔۔ مرکزیت پسند ریاست۔۔۔ جہاں مختلف وفاقی اکائیوں کے منصفانہ حقوق کو مکمل طور پر نظرانداز کیا جاتا ہو۔'' ایسا کرنے کی صورت میں ''۔۔۔ کبھی کبھی تو یہ (قومیتوں کا سوال) عالمی تصادم کو جنم دیتا ہے جب ایک چھوٹی اور محکوم قومیت اپنی نجات کے لئے باہر سے مدد حاصل کرتی ہے۔''

پاکستان بننے کے بعد مہاجرین کی بڑی تعداد کو سندھ میں آباد کیا گیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ''مہاجر مسئلہ'' پاکستان کے لئے عام طور پر اور سندھ کے لئے خاص طور پر دردِ سر بنا ہوا ہے اور وقت بہ وقت مختلف شکلوں میں سر اٹھاتا رہتا ہے۔ اس کے بارے میں سید نے کہا، ''جہاں تک ہندوستان سے آنے والے حقیقی مہاجرین کا تعلق ہے تو سندھ کی روایتی مہمان نوازی اور وسیع القلبی ان کے لئے پوری طرح موجود ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فطری بات ہے کہ ہم توقع کرتے ہیں کہ وہ سندھی قوم میں اپنے آپ کو ضم کریں، ان کے زبان اور کلچر کو اختیار کریں اور سندھ کے اجتماعی مفادات کو اپنا مفاد سمجھیں۔''

جاگیرداری، سرمایہ داری اور سوشلزم باقی دنیا کی طرح پاکستان میں بھی یقینی طور پر بہت بڑا ایشو رہا ہے اور ہمیشہ گرما گرم بحثوں کا موضوع بھی۔ خود کو بائیں بازو کا کہلوانے والوں کی اکثریت جی۔ایم۔سید کو جاگیردار اور رجعت پسند سمجھتے اور کہتے رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس اکثریت کی اکثریت جاگیرداروں کی پارٹیوں میں یا تو شامل ہوتی ہے یا ان کی حمایت کرتی ہے۔ اس موضوع پر 1948 میں جی۔ایم۔سید

کے خیالات کیا تھے، ان دوستوں سے ''ہمدردی'' کا اظہار کرتے ہوئے، چند سطور پیش کرتا ہوں: ''سوشلزم واحد معاشی نظام ہے جو کمزور طبقوں کو مکمل انصاف فراہم کرسکتا ہے۔۔۔آج ہماری ساری قومی دولت چند نوابوں، جاگیرداروں اور نئے صنعتکاروں کے ہاتھوں میں ہے۔۔۔ہمارے باقی سارے لوگ ''ادنیٰ'' مزدوروں کے ایک بڑے ہجوم کی طرح غلامانہ زندگی گذار رہے ہیں۔اتنی بڑی ناہمواری اور استحصال کی صورتحال کو فوراً ختم ہونا چاہیے ورنہ انتشار اور بدحالی کی موجودہ صورتحال۔۔۔آخرکار پُرتشدد انقلاب کو جنم دیگی۔''

بھارت دشمنی اور مذہبی انتہا پسندی پر مبنی پالیسیوں کے حوالے سے قراردادِ مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے ویانا کی عالمی امن کانفرنس میں انہوں نے کہا''۔۔۔قراردادِ مقاصد کی روح اور الفاظ نے مسلم لیگ کے اندر اور باہر لازمی طور پر لوگوں کے ایسے گروہ پیدا کردیئے ہیں جو موجودہ حکومت کو ایسی پالیسیاں اختیار کرنے کے لئے مجبور کررہے ہیں جو ایک مذہبی ریاست کو جنم دیں گی جو ہر وقت بھارت کے ساتھ حالتِ جنگ میں رہے گی۔''

پنجاب کے گورنر سلمان تاثیر اور اقلیتوں کے مرکزی وزیر شہباز بھٹی کے قتل جیسے حالات کی پیش بینی کرتے ہوئے 1952 کی امن کانفرنس میں انہوں نے کہا ''رجعت پسند اور نیم مذہبی گروہوں کے طاقت میں آنے کے بعد۔۔۔مذہب میں اختلاف رائے رکھنے والوں کو قتل کردیا جائے گا۔''

مسلم ممالک کے حکمرانوں کی طرف سے سامراجی طاقتوں کو اپنے ممالک کے اندر مداخلت کے مواقع دینے کے عمل کا مدبرانہ تجزیہ کرتے ہوئے سید نے کہا،''ہمارے ممالک بے بس بن جائیں گے جب غیر ملکی افواج ان کی سرزمین پر موجود ہوگی اور ان کا

قومی اقتدارِاعلیٰ ختم ہو جائے گا۔''

ساتھ ہی عالمی طاقتوں کو انتباہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا، ''میں اس کانفرنس کے مندوبین کو عمومی طور پر اور برطانیہ اور امریکہ کے مندوبین کو خصوصی طور پر باور کرانا چاہوں گا کہ امریکہ اور برطانیہ کی حکومتیں مسلمانوں کو مذہبی بنیادوں پر متحد کرنے کی جو کوششیں کر رہی ہیں وہ خطرناک امکانات سے لبریز ہیں۔''

آخری بات یہ کہ یہ کتاب سب سے پہلے اردو زبان میں کیوں، تو جواب بالکل سادہ ہے۔ جی۔ایم۔سید کی فکر، جدوجہد اور شخصیت کے بارے میں اردو زبان میں بہت کم معلومات موجود ہیں جبکہ دوسری طرف ان کے خلاف سب سے زیادہ کہا اور لکھا گیا اردو زبان میں۔ تو یہاں ہمارا مقصد ان کے بارے میں کسی قسم کی صفائی پیش کرنا نہیں۔ ایسی غیر معمولی اور تاریخی شخصیات کو کسی صفائی، کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر غیر معمولی شخص متنازعہ ہوتا ہے اور ہر غیر متنازعہ فرد معمولی ہوتا ہے اور متنازعہ ہونا ان غیر معمولی شخصیات کی سچائی اور ایمانداری کا ثبوت ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو کسی مجبوری سے یا اپنی مرضی سے سندھی زبان پڑھنے سمجھنے سے قاصر ہیں، ہماری خواہش اور کوشش ہے کہ ان تک سچائی اور دانائی کی یہ داستان پہنچائی جائے تاکہ کل کو جب تلخ حقیقتیں اور ناگزیر نتائج ان کے سامنے ہوں تو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ''ہمیں خبر نہ ہوئی۔''

10 اپریل 2011ء

عبدالخالق جونیجو

کراچی

دیباچہ

جناب عبدالخالق جونیجو صاحب کی مرتب کردہ اس کتاب میں سندھ کے معروف سیاسی رہنما اور مفکر جناب جی ایم سید کی چند اہم اور تاریخی اہمیت کی حامل تحریریں یکجا کردی گئی ہیں۔ ہر چند کہ یہ کتاب بہت مختصر ہے اور شاید کچھ قارئین کو اس کے مطالعے کے بعد تشنگی کے احساس سے بھی دوچار ہونا پڑے تاہم اس بات کا اعتراف کرنے میں شاید کوئی بھی بخل سے کام نہیں لے گا کہ اس کتاب میں شامل تحریریں نہ صرف اہم مباحث پر مشتمل ہیں بلکہ یہ راست فکری اور غیر معمولی تدبر کی بھی حامل ہیں۔ جی ایم سید صاحب نے سیاست کے نشیب و فراز بھی بہت دیکھے تھے اور ان کا مطالعہ بھی بڑا وسیع تھا۔ خاص طور سے انہوں نے ادب، مذاہب عالم اور تصوف کے بارے میں خاصا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اُن کے مشاہدات و تجربات اور وسیع مطالعے کا نچوڑ اِن مضامین میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

جناب جی ایم سید ایک عرصہ سندھ کے نوجوانوں کے دلوں پر حکومت کرتے رہے۔ انہوں نے آج کے سندھ کی سوچ اور اس کے طرزِ فکر کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سندھ میں سندھی نیشنلزم کے ابھار اور قیامِ پاکستان کے بعد مختلف ادوار میں آمرانہ حکومتوں کے خلاف یہاں سے اٹھنے والی مزاحمتی تحریکوں کے پیچھے دیگر عوامل کے علاوہ جی ایم سید صاحب کی فکر بھی ایک اہم عنصر کے طور پر کارفرما رہی ہے۔

پاکستان میں ابتداء ہی سے قومی وحدت، ملکی سالمیت، مملکت کے سیاسی و سماجی نظام اور اس کے طرزِ حکمرانی کے حوالے سے دو طرح کے رجحانات موجود رہے ہیں۔ پہلا رجحان جو بجائے خود ایک نظری و فکری سانچے (Idiological Paradigm) کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اس خیال کا حامل ہے کہ ایک مضبوط مرکز کے ذریعے ہی مملکت کے اتحاد اور ترقی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ وہ معیشت کا شعبہ ہو یا سیاست، سماجی شعبہ ہو یا امورِ خارجہ، ریاست کے سب ہی امور مضبوط مرکزی طاقت کے ذریعے چلانے ہی سے ترقی کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ اسی ذریعے سے قومی وحدت قائم کی جا سکتی ہے اور ملک کو قوموں کی برادری میں قابلِ ذکر پہچان سے ہم کنار کیا جا سکتا ہے۔

مذکورہ طرزِ فکر کے حامل افراد اور اُن سے مرتب ہونے والے حلقے مضبوط مرکز کی وکالت کرتے وقت محض حب الوطنی کا واسطہ نہیں دیتے بلکہ مذہب کے نام کا بھی بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت خود مذہب کی بھی ایک ایسی تعبیر پیش کی جاتی ہے جو تنوعات سے انکار اور بالجبر یکسانیت قائم کرنے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ایک خدا اور ایک کتاب کے پیروکاروں کو ایک ہی سیاسی پیکر میں ڈھل جانا چاہئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایک عرصے تک ہماری بیشتر مذہبی سیاسی جماعتیں وفاقی طرزِ حکومت ہی کی مخالف تھیں اور 1951ء میں ملک کے 32 مقتدر علماء کرام نے جن میں کم و بیش سب ہی مسلکوں کے علماء شامل تھے، مملکت کے لئے پیش کردہ اپنے مشترکہ پروگرام میں وحدانی طرزِ حکومت کی پُرزور حمایت کی تھی، حالانکہ اُس وقت مشرقی بنگال بھی پاکستان میں شامل تھا، جو ملک کے مغربی حصے سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ چنانچہ ان علماء نے اپنے 22 نکاتی مشترکہ منشور کے اکیسویں نکتے میں یہ تجویز پیش کی تھی:

''ملک کے مختلف ولایات و اقطاع، مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ان کی حیثیت نسلی،لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہو گی۔جنہیں انتظامی اختیارات کے پیشِ نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔''

ایک کثیر اللسانی اور کثیر النسلی مملکت میں جہاں غیر معمولی تنوعات پائے جاتے تھے، ہمارے علماء وحدانی طرزِ حکومت کی وکالت کرر ہے تھے۔ یہ بات دلچسپی کا باعث ہے کہ ہمارے بہت سے علماء آج بھی اس 22 نکاتی منشور کا حوالہ دیتے ہیں اور اس کو ملک کے سب مسائل کا حل گردانتے ہیں جبکہ یہی علماء وفاقیت کی بھی بات کرتے ہیں اور ان میں سے کئی 1937ء کے دستور پر حلف بھی اٹھاتے رہے ہیں۔سوچ کا یہ اسلوب اختیار کرنے والے بڑے اطمینان کے ساتھ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے سندھی، پنجابی، پختون اور بلوچ ہونے پر اصرار نہیں کرنا چاہئے اور یہ کہ ہماری واحد شناخت صرف اسلام اور پاکستان کے حوالے سے ہونی چاہئے۔ پاکستان میں اس مرکزیت پسندانہ سوچ کے حامل سیاست دانوں کی طرح دانشوروں کی بھی کبھی کمی نہیں رہی۔اسی طرح ہمارے میڈیا کا بھی مجموعی کردار کم وبیش اسی سوچ کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ ملک کے نظامِ تعلیم اور نصاب کا رخ بھی اسی طرف ہے بلکہ نئی نسلوں کو مرکزیت پسندی کی راہ پر ڈالنے کے لئے سب سے مؤثر ہتھیار کے طور پر نصاب ہی کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ بد قسمتی سے آج تک اس سوچ کے نتائج وعواقب کا بھی کوئی معروضی جائزہ لینے کی کوشش نہیں ہوئی۔ان تمام کاوشوں کے باوجود جو مضبوط مرکز کے حامل حلقوں کی طرف سے کی گئیں نہ تو ملک کبھی قومی وحدت کا آئینہ دار بن سکا اور نہ ہی ملک میں

اُن شورشوں کا سدِ باب ہوسکا جن کے آگے بند باندھنے کی خاطر اس مرکزیت پسندانہ سوچ کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

مرکزیت پسندانہ اس فکر کے مقابل ایک دوسری فکر بھی ہمارے ہاں موجود رہی ہے جو مرکزیت پسند سوچ کے ردِ عمل میں مزید پختہ اور مقبول ہوتی رہی ہے۔ یہ علاقائی، صوبائی اور قومیتی خودمختاری کے علمبرداروں کی سوچ ہے جو مرکز کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہمیشہ روز افزوں رہی ہے۔ مرکز کی طرف سے ان عناصر کو انتہا پسند، علیحدگی پسند اور ایسے ہی دوسرے القابات سے پکارا جاتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ان لوگوں کے موقف کو ضروری توجہ اور خلوص کے ساتھ سنا اور سمجھا جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ علاقائی خودمختاری کے علمبردار سیاست دانوں کی آراء میں کچھ چیزیں خلافِ واقعہ بھی ہوں اور اُن سے اختلاف کی گنجائش بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی لیکن کسی کی ساری ہی سوچ اور فکر کو خاص طور سے جب کہ وہ تحریر و تقریر کے معروف جمہوری اصولوں کے مطابق پیش کی جارہی ہو، سننے اور سمجھنے سے انکار کردینا کسی طور مناسب نہیں۔ اس کتاب میں جی ایم سید صاحب کی جو تحریریں یکجا ہیں ان کو پڑھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ کاش ہمارے سیاسی سفر کے آغاز پر پیش کئے جانے والے یہ افکار رَد نہ کردیئے جاتے اور ان کی اصابت کو محسوس کیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید ہمیں اُن بہت سے بحرانوں سے دوچار نہ ہونا پڑتا جنہوں نے آزادی کے بعد ہمارے سیاسی سفر کو داغ دار کیا۔

ہماری یہ بھی بدقسمتی رہی کہ جی ایم سید اور اُن جیسے دوسرے رہنماؤں جو قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی حکومتوں کے زیرِ عتاب آئے، اور جنہوں نے بعد میں پاکستان کی دوسری آمرانہ حکومتوں کی بھی ناراضگی مول لی، ہمیشہ ہمارے قومی بیانیے اور National Discourse میں نہ صرف یہ کہ نظر انداز کیا گیا بلکہ انہیں ایک

منفی قوت کے طور پر بھی پیش کیا گیا۔صرف جی ایم سید پر ہی کیا موقوف ہمارے یہاں صوبائی اور قومیتی حقوق کا کون سا علمبردار ہو گا جو عتاب کا شکار نہ ہوا ہو اور جس نے عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصہ پسِ دیوارِ زنداں نہ گذارا ہو۔ایسے معتوبین کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں جی ایم سید کے علاوہ خان عبدالغفار خان، عبدالصمد خان اچکزئی، میر غوث بخش بزنجو، عطاء اللہ مینگل اور نہ جانے کتنے ہی ایسے دیگر نام شامل ہوں گے۔ان سب لوگوں کی طویل اور بھرپور سیاسی جدوجہد میں، کہیں نہ کہیں کوئی سیاسی غلطی بھی ہوئی ہوگی، ہوسکتا ہے کہ انہوں نے فیصلے کرتے وقت حالات کا بہت اچھا تجزیہ نہ کیا ہو۔کسی بھی سیاست دان کی طرح ان سب حضرات کی سیاست سے بھی کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی حوالے سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کی سیاست قومیتی حقوق کی بازیافت، صوبائی خودمختاری کے حصول، وسیع تر جمہوری اقدار کی بحالی اور ایک روشن خیال، معاشرے کے قیام کی سیاست تھی۔

بدقسمتی سے بجائے اس کے ان سب مقتدر شخصیات کے تجربات اور ان کی اجتماعی سیاسی بصیرت سے استفادہ کیا جاتا، ان سب ہی لوگوں کو ملک کی تعمیر اور ترقی کے کارِ خیر سے دور رکھا گیا بلکہ ان کو پروپیگنڈے کے ذریعے طرح طرح کے الزامات کا ہدف بھی بنایا گیا۔ایک عام آدمی اور خاص طور سے ان سب سیاست دانوں کے حلقہ ءاثر سے باہر، ہر شخص ان کے بارے میں اُسی منفی سوچ کا حامل رہا جس کو فروغ دینے کے لئے حکومتوں نے بڑھ چڑھ کر کوششیں کی تھیں۔یہی نہیں بلکہ ہمارے بیشتر ذرائع ابلاغ اور ماضی میں نام نہاد قومی پریس کہلانے والے اخبارات وجرائد نے بھی ان لوگوں کے امیج کو مسخ کر کے پیش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ اسی یک طرفہ پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے کہ مذکورہ بالا شخصیات میں سے ہر ایک ہماری تاریخ اور

ہمارے نام نہاد قومی بیانیے میں ناپسندیدہ فرد (Persona non grata) کی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ ان پسندیدہ افراد میں سرفہرست جناب جی ایم سید کا نام ہے جو صرف سیاست دان ہی نہیں تھے بلکہ بیسیوں کتابوں کے مصنف، تصوف کے بحرِ زخار کے غواص اور ادبیات پر گہری نظر رکھنے والے انسان تھے۔

بدقسمتی سے ہمارے حکمران طبقوں اور ان کے ہم خیال اہل دانش نے اچھائی اور برائی، 'اچھے' لوگوں اور 'برے' لوگوں، محب وطن پاکستانیوں اور غیر محب وطن لوگوں کے ایسے الگ الگ خانے بنا دیئے ہیں جن میں یہ طبقات اور دانشور خود کو تو ہمیشہ 'اچھے' خانے میں جبکہ اپنے ناقدین کو 'برے' خانوں میں دیکھتے اور دکھاتے رہے ہیں۔ یہ خانہ سازی سرکاری ذرائع ہی سے نہیں ہوتی بلکہ اس میں آزاد ذرائع ابلاغ بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ 'اچھے' باور کرائے جاتے ہیں ان کا احترام واجب ہو جاتا ہے، وہ فرشتہ صفت قرار پاتے ہیں، ان پر تنقید مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتی ہے، ان پر علمی سطح پر بھی ناقدانہ گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ یہ فرشتہ صفت لوگ بالآخر فرشتے ہی رہ جاتے ہیں، ان پر انسان ہونے کے ناتے بات نہیں کی جا سکتی کہ انسانوں پر ہونے والی کوئی بھی گفتگو صرف خوبیوں تک محدود نہیں رہ سکتی۔ ہماری قومی سیاسی شخصیات سب اسی زمرے میں آتی ہیں۔

شخصیات کی اس Sterio typing میں دوسری وضع کے لوگ وہ ہیں جن کو 'برا' قرار دے دیا گیا ہے۔ ان کے 'برا' ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کو ایسا مشہور کر دیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ ان کی پہچان منفی طور پر ثبت کروا دی جائے تو پھر مزید تحقیق اور غور و فکر کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی جاتی کہ شاید کل کلاں کوئی ان کو مختلف انداز میں نہ دریافت کر لے۔ تاریخ پاکستان میں ایسے کئی لوگ آ چکے ہیں جن کے بارے میں منفی پروپیگنڈے کے نتیجے میں ان کی اصل شخصیت اور خیالات ایک دنیا کی نظروں سے

اوجھل رہے ہیں۔ جی ایم سید صاحب نہ تو کوئی فرشتہ تھے اور نہ ہی ولی یا اوتار۔ شخصی کمزوریاں ان میں بھی رہی ہوں گی اور سیاسی فیصلہ سازی میں انہوں نے بھی کہیں نہ کہیں چوک دکھائی ہوگی۔ مگر وہ ایسے انسان اور رہنما نہیں تھے جیسا ان کو بنا کر پیش کیا جاتا رہا۔ ان پر غیر محب وطن ہونے کا ٹھپہ لگا کر قومی امور میں ان کو دیوار سے لگانے کی کوشش کی گئی، ان کی نقل وحرکت گھر تک محدود کر دی گئی اور ان کو تحریر وتقریر کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ ان کے لئے عرصۂ حیات تنگ کر دینے والوں کے لئے البتہ یہ بات باعثِ شرمندگی ہونی چاہئے کہ سندھ میں سید صاحب کا نام آج بھی احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور اب ان کے حوالے سے دوسرے صوبوں میں بھی سوچ کا انداز بدل رہا ہے۔ شاید سید صاحب بھی عالم برزخ میں یہ کہتے ہوں کہ ؎

بُرے ہیں ہم مگر ایسے بُرے بھی کم ہوں گے
کسی زمانے کے اچھے ہمیں کریں گے یاد

لوگوں کو ان کے اصلی خدوخال اور شخصی وسماجی تناظر سے ہٹا کر اور اپنے پسندیدہ سانچوں میں ڈھال کر پیش کرنے کے عمل یعنی Sterio-typing کا نتیجہ ہے کہ اکثر جب ہم ایسے لوگوں کی سچی تصویر کو دیکھتے ہیں تو بڑی دیر تک ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔

جناب جی ایم سید کے حوالے سے ذہنوں کو کس قدر متنفر کر دیا گیا تھا اور حقیقت حال کے منکشف ہونے پر وہ کس طرح کی حیرت کا شکار ہو سکتے تھے اس کا اندازہ راقم السطور کو کوئی پچیس سال پہلے ہوا۔ یہ 1987ء کی بات ہے کہ کراچی یونیورسٹی میں ہمارے پاکستان اسٹڈی سینٹر نے علامہ اقبال کی مشہور کتاب 'فکر اسلامی کی تشکیل جدید' کے موضوع پر ایک تین روزہ کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس کے مندوبین

اور مقررین میں پروفیسر محمد عثمان بھی شامل تھے جو ترقی پسند سوچ رکھنے والے دانشور تھے اور لاہور سے تشریف لائے تھے۔ اُن دنوں پاکستان اسٹڈی سینٹر میں ڈاکٹر درِّ شہوار سید (مرحومہ) بھی موجود تھیں جو کچھ ہی عرصہ قبل شاہ عبداللطیف بھٹائی پر پی۔ایچ۔ڈی کر کے انگلستان سے نئی نئی واپس آئی تھیں۔

کانفرنس کے اجلاسوں کے درمیان کسی وقفے میں پروفیسر عثمان کی ڈاکٹر درِّشہوار سید سے علیک سلیک ہوئی اور وہ اُن کے علم، ان کی طبعیت کے انکسار اور اُن کی شخصیت کے وقار سے بے حد متاثر ہوئے۔ البتہ دوران گفتگو جب پروفیسر عثمان کو یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر درِّشہوار جناب جی ایم سید کی صاحب زادی ہیں تو وہ سخت حیران ہوئے اور اُن کو یقین نہیں آیا کہ وہ اتنی دیر سے جی ایم سید کی صاحب زادی سے گفتگو کر رہے تھے۔ اُن کو بڑی حیرت ہوئی کہ جس شخص کے بارے میں انہوں نے سب کچھ برا ہی سنا تھا اُس کے گھرانے میں ایک خاتون اتنی عالم فاضل اور اتنی نیک طبعیت کی حامل بھی ہوسکتی ہیں۔ اگلے دو تین روز انہوں نے زیادہ سے زیادہ وقت ڈاکٹر سید سے گفتگو میں صرف کیا اور جناب جی ایم سید کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ڈاکٹر سید سے مل کر پروفیسر عثمان کو جو حیرت ہوئی تھی اُس کا ذکر انہوں نے مجھ سے بھی کیا۔ تب میں نے گزارش کی کہ ڈاکٹر صاحب، ہوسکتا ہے کہ جی ایم سید صاحب سے مل کر آپ کو اس سے بھی زیادہ حیرت ہو۔

بہر حال، یہ تو جملہ ہائے معترضہ تھے۔ میرا مقصد پڑھنے والوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا تھا کہ ہم نے اپنے ملک کی بعض مقتدر اور محترم شخصیات کی طرف سے اغماز برت کر اور اُن کے موقف کو بغیر پڑھے اور سنے رَد کرنے کا جو رویہ اختیار کیا تھا وہ کسی طور ہمارے لئے سودمند ثابت نہیں ہوا۔ اب اس کتاب میں شامل مضامین پر ایک نظر ڈالیں اور تصور کریں کہ ان میں کَون سی ایسی بات تھی جو ہمارے حقیقی قومی

مفادات کے خلاف قرار دی جا سکے۔ بلکہ ان مضامین میں بعض ایسے اندیشیوں کا بھی ذکر ہے جو محض 50،40 سال بعد حقیقت کا روپ دھار کر ہمارے معاشرے کو تہہ و بالا کرنے کا موجب بن رہے ہیں۔

اس کتاب میں پاکستان پیپلز آرگنائزیشن کا جو سیاسی پروگرام اور لائحہ عمل دیا گیا ہے۔ اُس کے نکات بعد میں دیگر جمہوری و سیاسی جماعتوں نے بھی قبول کیے مگر پاکستان پیپلز آرگنائزیشن کو قیامِ پاکستان کے بعد یہ پروگرام پیش کرنے کی پاداش میں سخت مزاحمت اور سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس وقت کی حکومت نے اس تنظیم کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی مہلت بھی نہیں دی اور اس کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ اس تنظیم کے سیاسی پروگرام اور لائحہ عمل کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو قائم کرنے والے جن میں خان عبدالغفار خان اور جی ایم سید پیش پیش تھے، کن نظریاتی خطوط پر سوچ رہے تھے اور انہوں نے پاکستان کو ایک جمہوری اور وفاقی مملکت بنانے کی خاطر کس قدر سوچ بچار کیا تھا۔ اس تنظیم کو چند واضح مقاصد کو سامنے رکھ کر قائم کیا گیا تھا۔ یہ تنظیم پاکستان کو ایک خودمختار مملکت دیکھنا چاہتی تھی جو عالمی استعماری طاقتوں کی دست بُرد اور اُن کی کاسہ لیسی سے آزاد ہوتی اور اپنے شہریوں کی فلاح و بہبود کے لئے مصروفِ عمل ہوتی۔ اس تنظیم کے پیشِ نظر پاکستان کو سوشلسٹ جمہوریتوں پر مشتمل ایک وفاق کی شکل میں تعمیر کیا جانا تھا جہاں معیشت اشتراکی اصولوں پر استوار ہوتی اور وفاقی وحدتیں خودمختاری کی حامل ہوتیں۔ یہ کوئی ملک دشمن منصوبہ نہیں تھا بلکہ اُس زمانے میں بہت سے نو آزاد ملکوں استعمار سے آزادی کے بعد اپنے لئے یہی راستہ منتخب کیا تھا۔

مجوزہ سیاسی پروگرام میں چار بنیادی نکات کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ اوّل، پاکستان کی مکمل آزادی اور خودمختاری اور سامراجی طاقتوں سے الگ رہ کر ایک

غیر جانبدار پالیسی پر کاربند ہونا، دوئم، پاکستان کی جمہوری شناخت کا قیام۔ سوئم، ایک حقیقی وفاقی نظام کا احیاء جس میں سوشلسٹ طرزِ معیشت کو اختیار کیا گیا ہو، اور چہارم، ریاست کی غیر فرقہ وارانہ تشکیل تاکہ سب شہری قانون کی نظر میں برابر قرار پائیں۔

مذکورہ پروگرام کے علاوہ کتاب میں شامل جی ایم سید صاحب کا استقبالیہ خطبہ جو پیپلز آرگنائزیشن کے قیام کے وقت کراچی میں منعقدہ کنونشن میں پڑھا، اُن کے خیالات کی بہت اچھی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ سندھ کے تاریخی کردار اور اس کی تہذیبی قوت کا ذکر کرنے کے بعد جدید عہد کے چیلنجوں کا ذکر کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ 'اگر ایک اچھے اور خوشحال پاکستان کے تصور میں ہم واقعی ایمان دار اور جمہوری ہیں تو ہم سندھی قوم کی حب الوطنی کی ان روایات کو نئے ملک کے ان وسیع مفادات سے ہم آہنگ پائیں گے۔ صرف باہمی احترام اور برابری کا احساس ہی مختلف قوموں کو ایک وسیع دائرے میں سما سکتا ہے۔'

واضح رہے کہ یہ 1948ء کی تحریر ہے۔ گویا پاکستان بننے کے ایک سال بعد کی ـــــ محولہ بالا جملوں سے یہ بات بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل مسلم لیگ اور اُس کی قیادت کے ساتھ جی ایم سید کے اختلافات کچھ بھی رہے ہوں اور ان اختلافات نے شخصی رنجشوں کی شکل بھی کیوں نہ اختیار کر لی ہو، آزادی کے بعد جی ایم سید نئے ملک کی تعمیر کے لئے کشادہ دلی کے ساتھ ایک سیاسی پروگرام کی ہم رکابی میں تھے۔ انہوں نے اس خطے میں عوام کی ہمہ جہتی ترقی کی خاطر ماضی کی رنجشوں کو بھلا کر تعاون کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ صد افسوس کہ اُن کے اس جذبے کی قدر نہیں کی جا سکی۔ اپنی اس تحریر میں جنابِ سید اسلامی تاریخ کے حوالے بھی دیتے ہیں اور اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ اسلام تنوعات کی حوصلہ شکنی کرنے کے بجائے اُن کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ سو ان تنوعات کی بیخ کنی

کے لئے مذہب کا نام استعمال کرنا سراسر ناانصافی ہے۔

وہ وفاقی طرزِ حکومت کی بھی پُرزور وکالت کرتے ہیں اور 1940ء کی قراردادِ لاہور کے اندر پائی جانے والی روح سے اکتساب کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جی ایم سید صاحب 1948ء کے اُس نازک دور میں جبکہ سندھ کی دھرتی پر نقل مکانی اور اضافہء آبادی کا زبردست بوجھ پڑ رہا تھا، ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کو خوش آمدید کہتے نظر آتے ہیں اور سندھ کے اجتماعی مفادات کے ساتھ مہاجرین کے ہم آہنگ ہونے کو سندھ اور خود اُن کے لئے خوش آئند قرار دیتے نظر آتے ہیں۔

سوشلزم کی بابت اُن کا خیال ہے کہ وہ کمزور طبقوں کو با اختیار بنانے اور اُن کو انصاف سے ہم کنار کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ وہ معاشرے کی ہمہ گیر اصلاح کی بات کرتے ہیں اور ایک ایسی سماجی تبدیلی کی وکالت کرتے ہیں جو پسے ہوئے طبقوں کو اُن کی پس ماندگی سے نکال کر خوش حالی کی طرف لے جا سکے۔ موجودہ کتاب میں جی ایم سید صاحب کی وہ تقریر بھی شامل ہے جو انہوں نے 1952ء میں ویانا میں ہونے والی ایک کانفرنس میں کی تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے کھل کر مغربی طاقتوں کی اُس پالیسی کی مذمت کی تھی جو وہ اشتراکیت کا مقابلہ کرنے کے لئے مذہب کو استعمال کرنے کے حوالے سے اختیار کئے ہوئے تھیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ 'مغربی طاقتوں کی یہ پشت پناہی جاری رہی تو ترقی پذیر اور پس ماندہ ملکوں کے رجعت پسند اور انتہا پسند مذہبی عناصر صورتحال سے فائدہ اٹھا کر سیاسی اقتدار پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ عناصر اپنے اپنے ملک میں قرونِ وسطٰی کے دور کا سماجی اور سیاسی نظام واپس لانے کی کوشش کریں گے۔ وہ جنگجویانہ رویوں کو فروغ دیں گے اور مخالفوں کو تہہ تیغ کرنے کی پالیسی اختیار

کریں گے۔' حیرت ہوتی ہے کہ کوئی ساٹھ سال قبل جی ایم سید جو باتیں کررہے تھے وہ آج کے پاکستان میں ہو بہو اسی شکل میں سامنے آچکی ہیں۔ آج ملک میں سب ہی امن پسند لوگ اس مذہبی انتہا پسندی اور مذہب کے نام پر جاری قتل و غارت گری، خودکش حملوں، بم دھماکوں اور ایسے ہی دوسرے پُرتشدد واقعات پر آنسو بہاتے نظر آتے ہیں۔ اخبارات ان واقعات کے تجزیوں میں کالم کے کالم سیاہ کرتے ہیں۔ ٹی وی اسکرینیں خون کے دھبوں سے اٹی نظر آتی ہیں۔ سیاست دان ہر روز ان واقعات پر مذمتی بیانات جاری کرتے ہیں مگر یہ طوفان ہے کہ تھمنے میں نہیں آتا۔ فارسی کا مشہور مقولہ ہے کہ بے وقوف وہی بات کہتا ہے جو عقل مند کہتے ہیں، مگر بے وقوف کے اس بات کو کہنے کے وقت تک بہت سا نقصان ہو چکا ہوتا ہے۔

بہرحال یہ اور ایسے ہی مسائل اور امور ہیں جن کی بابت جی ایم سید صاحب کی سوچ اور فکر کے مختلف پہلو اس کتاب کے ذریعے پڑھنے والوں کے سامنے آئیں گے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس کتاب کو توجہ سے پڑھا جائے اور آج کے حالات کے تناظر میں اس سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

27 اپریل 2011ء

ڈاکٹر سید جعفر احمد
پاکستان اسٹڈی سینٹر
جامعہ کراچی

فکرِ جی۔ ایم۔ سیّد اور آج کا پاکستان

عبدالخالق جونیجو

جی۔ایم۔سیّد بلاشبہ پاکستان کی سب سے زیادہ متنازعہ شخصیت تھے۔اور بلاشبہ دنیا کے تمام بڑے لوگ، تمام غیر معمولی شخصیات متنازعہ ہوتی ہیں۔ اور وہ اس لئے متنازعہ ہوتے ہیں کہ وہ نئے خیالات لے کر آتے ہیں، ایسے خیالات جو اُس وقت کی روایات اور تصورات کے خلاف ہوتے ہیں اور ایسے خیالات جو متعلقہ ریاست کے نظریات اور قوانین کو چیلنج کرنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر وقت اور حالات ان خیالات کو سچا ثابت کرتے ہیں۔اس سلئے ہی یہ کل کے متنازعہ شخص آنے والی کل میں عظیم انسان تسلیم کئے جاتے ہیں، چاہے وہ مفکر و دانشور ہوں، سیاسی اور انقلابی لیڈر ہوں یا سائنسدان ہوں۔اسی پس منظر میں شاید جارج برنارڈ شا نے کہا تھا کہ "All great truths start as blasphemies"، یعنی تمام بڑے سچ شروع میں کفر ہوتے ہیں۔

63 برس سے سندھ پاکستان میں شامل ہے۔اس پورے عرصے کے دوران پاکستان کی ریاست بحرانوں کا شکار رہی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ پاکستان کے حکمران مسلسل یہ کہتے رہتے ہیں کہ "ملک کے وجود کو سنگین خطرات لاحق ہیں"

اور یہ کہ ''ہم ملک کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

پاکستان بننے کے بعد سائیں جی۔ایم۔سید 48 سال زندہ رہے۔اس عرصے کا آدھا وقت یعنی 24 برس انہوں نے سندھی سماج میں تبدیلیاں لانے کے ساتھ پاکستانی ریاست کو درست راستے پر چلانے کی کوششوں میں صرف کئے جبکہ بقایا 24 سال، پاکستان میں درستی کے امکانات سے مایوس ہونے کے بعد، سندھ کی قومی آزادی، ترقی اور خوشحالی (اور عالمی امن اور بنی نوع انسان کی ترقی) کے لئے جدوجہد میں گذارے۔

اس تمام عرصے کے دوران انہوں نے ایسے خیالات پیش کئے، ایسی سوچ دی اور ایسے مقاصد کے لئے جدوجہد کی جو اس خطے میں امن و بھائی چارے کے لئے اور اس میں رہنے والے انسانوں کی نجات، ترقی اور خوشحالی کے لئے تو انتہائی کارآمد تھے لیکن وہ پاکستان کی ریاستی پالیسیوں کے لئے ایک بڑا چیلنج پیش کر رہے تھے۔ نتیجے میں پاکستان کے حکمران (ظاہری اور خفیہ) ان کے سخت مخالف (بلکہ یوں کہیے کہ دشمن) بنے رہے کیونکہ وہ سید کے فکر اور جدوجہد کو اپنے استعماری اور استحصالی مقاصد کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بنگال کو چھوڑ کر باقی پاکستان میں جی۔ایم۔سید ہی ریاستی اسٹیبلشمنٹ اور اس کی قبضہ گیری، تفریق، لوٹ مار اور جنگی جنون کی پالیسیوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھے۔ یہی سبب تھا کہ محمد علی جناح سے لے کر بینظیر بھٹو کے دوسرے دورِ حکومت تک (جب تک سید زندہ تھے) تمام حکمران ان کو جیل اور نظر بندی میں رکھتے آئے جبکہ ریاستی ادارے اور ان کے ساتھاری اور تنخواہ دار ملّا، دانشور، اور لکھاری ان کو غدار، ملک دشمن، کافر اور عوام دشمن جیسے القاب دے کر ان کی کردار کشی کرتے رہے۔

اس عرصے کے دوران پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے مختلف حصے اور اسلام، پاکستان

کے نام پر کمائی کرنے والے مختلف گروہ مختلف اوقات میں ایک دوسرے سے توڑتے (اور بنتے) رہے لیکن سید کے خلاف یہ سارے ہمخیال اور متحد تھے۔ 'جمہوریت کے چیمپئن' فوجی آمروں کے ساتھ، 'سوشلسٹ' مُلّاؤں کے ساتھ اور 'ترقی پسند' رجعت پسندوں کے ساتھ تو کھڑے ہوتے تھے لیکن سید کو وہ سب اپنا دشمن سمجھتے تھے کیونکہ وہ سب اس دھوکے بازی، لوٹ مار اور جنگ وجدل پرمبنی 'کاک محل' سے فائدہ اٹھانے والے اور اس کے محافظ تھے جبکہ جی۔ایم۔سید اور ان کے نظریات اس کی بنیادوں کو کمزور کرنے والے تھے۔ اسی پس منظر میں پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد نے ایک مرتبہ کہا کہ ''پاکستان کی ریاست جی۔ایم۔سید کے خلاف ہمیشہ اس لئے رہی کہ سید کی اتنی بڑی شخصیت تھی کہ یہ تنگ نظر ریاست ان کو اپنے اندر سما نہیں سکتی تھی۔''

63 برس کے دوران پاکستان میں مختلف طرح کے، مختلف پس منظر کے اور مختلف پروگرام کے حکمران رہے ہیں۔ ان میں 'پاکستان کے بانی' بھی تھے تو 'ملک کو بچانے والے' بھی تھے، فوجی جرنیل بھی تھے تو 'عوامی نمائندے' بھی تھے، ڈکٹیٹر بھی تھے تو 'جمہوریت کے چیمپئن' بھی تھے، مرد بھی تھے تو عورتیں بھی تھیں، آکسفورڈ کے پڑھے ''روشن خیال'' بھی تھے تو خارجہ پالیسی کے 'ماہر' بھی تھے۔ وہ سب اتنے مختلف الخیال ہونے کے باوجود جی۔ایم۔سید کے حوالے سے ہمخیال اور ہمنوا تھے۔ وہ سب سید کو پاکستان دشمن، اسلام دشمن، عوام دشمن اور جمہوریت دشمن کہتے رہے اور خود کو پاکستان کا محافظ، اسلام کا شیدائی، عوام کا خیر خواہ اور جمہوریت کا چیمپئن کہلواتے رہے۔ یہی سبب تھا کہ پاکستان کی زندگی کے پہلے دن سے لے کر جی۔ایم۔سید کی زندگی کے آخری دن تک سارے حکمرانوں نے ان کو قید میں رکھا اور سب ملا کر یہ عرصہ تقریباً 30 سال بنتا ہے یعنی پاکستان میں ان کی گذاری زندگی کا 60 فیصد۔ یہاں تک کہ 1995ء میں جب بینظیر بھٹو کے دوسرے دورِ حکومت میں سید نے جناح اسپتال میں وفات کی تو

اُس وقت بھی حکومت کے بندوق باز کمرے کے باہر گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔

63 برس اچھا خاصہ عرصہ ہوتا ہے۔ دو نسلوں کا عرصہ گذر چکا تیسرے کا دور جاری ہے۔ آج پاکستان کی ریاست کس حال میں ہے، سماج کی کیا صورتحال ہے، مجموعی طور پر اور انفرادی حیثیت میں لوگ کن حالات میں زندگی گذار رہے ہیں اور اسلام کے نام پر چلنے والے مسلمان اکثریت کے اس ملک میں مسلمانوں کا کیا حال ہے، وقت آ گیا ہے کہ اس کا جائزہ لیا جائے۔ ملک کو چلانے کی پالیسیوں اور طور طریقوں کے بارے میں جی۔ایم۔سید کی باتوں اور بتائے ہوئے راستوں کو ایک طرف رکھ کر اور حکمرانوں کے اختیار کئے گئے طریقہ کار کو دوسری طرف رکھ کر، سامنے آنے والے نتائج کی بنیاد پر صورتحال کا تجزیہ کیا جائے۔

سب سے پہلی اور اہم بات جو سید نے نئی وجود میں آنے والی پاکستانی ریاست کے بارے میں کہی وہ یہ تھی کہ ''پاکستان ایک قوم نہیں بلکہ زیادہ قوموں کا ملک ہے جن میں تاریخ، زبان اور کلچر کے حوالے سے بہت زیادہ فرق ہے۔ وہ صرف اس صورت میں اکٹھی رہ سکتی ہیں کہ ان کے جداگانہ قومی تشخص کو تسلیم کیا جائے، ان کی حیثیت، عزت اور اہمیت کو برابر مانا جائے اور ملک کو ان کی مشترکہ رائے کے مطابق چلایا جائے۔'' دوسری طرف الف سے یے تک سارے حکمرانوں نے جی۔ایم۔سید سمیت (پنجاب کے علاوہ) تمام قوموں کے لیڈروں (شیخ مجیب الرحمان، خان عبدالغفار خان، عبدالصمد اچکزئی، میر غوث بخش بزنجو اور سردار عطاء اللہ مینگل) کو غدار اور بھارت اور روس کا ایجنٹ قرار دیا اور ملک کو ڈنڈے کے زور پر اور وحدانی طریقے سے چلانے کی کوشش کی۔ اپنے تاریخی قومی حقوق مانگنے کے بدلے میں باری باری تمام قوموں کے خلاف فوجی کارروائیاں کی گئیں، یہاں تک کہ ملک کی اکثریتی قوم بنگالیوں پر چڑھائی کرتے وقت کہا گیا کہ ''خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا۔'' نتیجہ کیا

ہوا؟ صرف 25 سال میں مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

اسی کشمکش کے دوران جی۔ایم۔سید بنگالیوں کے ساتھ تھے۔لیکن ان کے الگ ہو جانے کے بعد باقی ماندہ 'نئے پاکستان' کے حکمرانوں کی طرف سید نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور ماضی سے سبق سیکھتے ہوئے 'نئے پاکستان' کو نئے طریقے سے چلانے کی صورت میں اپنی حمایت کی پیشکش کی۔لیکن عوام کے نام پر سیاست کرنے والے ان لیڈروں نے بھی ملک کو اُسی پرانے طریقے سے بندوق کے زور پر چلانے کا راستہ اختیار کیا۔ بندوق کے زور پر 'ایک پاکستانی قوم' کو نہ ماننے والے سندھی، بلوچ اور پختون قومی رہنما یہ سارا عرصہ (1977-1972ء) قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ یہ پورا عرصہ بلوچستان میں تو فوجی آپریشن رہا۔اس کے بعد بھی لیڈر تو بدلے ہیں لیکن طریقہ حکمرانی نہیں بدلا اور تھوڑے بہت فرق کے ساتھ آج بھی وہی صورتحال ہے۔نتیجہ؟.......... زیادہ ٹکراؤ، نفرت، فوجی کارروائیاں اور لڑائی۔ اس کا مزید نتیجہ یہ ہے کہ پنجاب اور دوسری قوموں کے درمیان سارے ذہنی روابط ختم ہو چکے ہیں۔صرف بندوق کے زور پر ان کو ساتھ رکھا جا رہا ہے اور دوسری قومیں (سندھی، بلوچ، پختون اور سرائیکی) خود کو پنجاب کی کالونی سمجھ رہی ہیں جبکہ دنیا والے جن میں پاکستان کے دوست بھی شامل ہیں، بحیثیت ریاست اس کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگائے بیٹھے ہیں۔

دوسرا نہایت اہم معاملہ جو پہلے دن سے اس ملک میں متنازعہ رہا ہے اور جس کے لئے خود حکمرانوں کا کہنا ہے کہ اس سے ملک شدید ترین بحران میں مبتلا ہو گیا ہے جبکہ پاکستان کے عالمی ہمدرد اسے پاکستان کی ریاستی حیثیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیتے ہیں وہ ہے مذہب کو ریاست سے علیحدہ کرنے کا مسئلہ۔ اس مسئلے کے بارے میں بھی جی۔ایم۔سید اور پاکستان کے حکمرانوں کے رویے اور پالیسیاں ایک

دوسرے کے بالکل متضاد رہی ہیں۔ آج مختلف مذاہب اور ایک مذہب اسلام کے مختلف فرقوں کے درمیان جاری کشمکش اور مار اماری اور اس کے نتیجے میں سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کے قتل کے بعد میڈیا میں چلنے والی بحث نے سید کے خیالات کی اہمیت کو پہلے سے زیادہ اہم اور واضح بنا دیا ہے۔ پاکستانی سوسائٹی میں موجود چند روشن خیال اور باہمت لوگ جو باتیں کر رہے ہیں جی۔ایم۔سید نے ان کی نشاندہی 60-50 سال پہلے کی تھی۔

جی۔ایم۔سید نے پہلے دن سے کہا اور مسلسل کہتے رہے، تحریر اور تقریر کے ذریعے اور ملکی اور بین الاقوامی فورموں پر، کہ مذہب کو ریاستی معاملات سے علیحدہ رکھا جائے جبکہ ریاستی اداروں کی آشیرباد سے مذہبی قوتیں یہ مہم چلاتی رہیں کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک قوم ہیں اور پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کے بعد پوری دنیا پر مسلمانوں کی حکمرانی قائم کی جائے گی۔ اس طرح 'مسلم دنیا' کی عجیب وغریب اصطلاح کا استعمال کیا گیا۔ کہیں بھی ہمیں عیسائی دنیا، یہودی دنیا یا ہندو کی اصطلاح سننے میں نہیں آتی۔ پین اسلام ازم کی ایسی سوچ اور ایسی تحریک میں پنہاں خطرات کا پہلے سے ادراک کرتے ہوئے سید نے بہت پہلے پاکستان کے حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں کے ساتھ ساتھ عالمی طاقتوں کو ان کے امکانی خطرات سے خبردار کیا تھا۔ وہ امکانی نتائج وہی تھے جن کا آج دنیا کے اکثر ممالک خاص کر کے پاکستان سامنا کر رہا ہے۔ ایسی دور اندیشی والی اور سماج کی بہتری کی باتیں کرنے پر مذہبی قوتیں تو سید کے خلاف تھیں ہی لیکن لبرل اور 'روشن خیال' حکمران/سیاستدان بھی اپنی کوتاہ نظری اور وقتی اور خسیس اقتداری مفادات کی خاطر ان سے دشمنی رکھتے تھے۔ 'لبرل' ڈکٹیٹر ایوب خان ہو یا 'بنیاد پرست' جنرل ضیاء الحق، سب کا سید کے بارے میں اور ان کی سیکولر سوچ کے بارے میں رویہ ایک جیسا تھا۔ اس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ ایوب خان کے

اقتدار کے دس میں سے آٹھ سال جبکہ ضیاء الحق کے گیارہ میں سے نو سال جی۔ایم۔سید قید میں رہے۔پھر آکسفورڈ کے فارغ التحصیل اور سوشلزم کی باتیں کرنے والے 'سویلین' اور 'عوامی' حکمران ذوالفقار علی بھٹو بھی اس ضمن میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔انہوں نے بھی اپنے اقتدار کو طول دینے کی کوشش میں مذہب کو خوب استعمال کیا اور عوام کے مقبول لیڈر ہونے کی وجہ سے ان کے ایسے کردار کے سبب پاکستانی ریاست کے ساتھ ساتھ معاشرے کے اندر بھی مذہبی رجحانات بڑھنے کا عمل تیز ہوا۔اپنے اقتدار کو بڑھانے کی کوشش میں مولویوں کو خوش کرنے کی خاطر انہوں نے ایسے قوانین بنائے اور ایسے کام کئے جن کی بنیاد پر آگے چل کر بنیاد پرستی کی وہ تحریکیں چلیں جن کا آج پاکستان سمیت ساری دنیا کو سامنا ہے اور جن کی نشاندہی جی۔ایم۔سید پہلے سے کرتے رہتے تھے۔اور پھر جناب ذوالفقار علی بھٹو کے پانچ سالہ دورِ حکومت میں سے ساڑھے چار سال سید قید میں رہے۔

نہ صرف جی۔ایم۔سید لیکن سندھ، بلوچستان اور پختونخوا کے سیکولر اور رواداری سوچ کے مالک لیڈر (جیسا کہ خان عبدالولی خان، ائیر مارشل اصغر خان، میر غوث بخش بزنجو، عطاء اللہ مینگل اور نواب خیر بخش مری) اور سارے ملک کے ترقی پسند اور روشن خیال سیاسی رہنما اور کارکن، ادیب، شاعر، صحافی اور دانشور یا تو جیلوں میں ہوتے تھے یا جلاوطن، یا پھر انڈر گراؤنڈ (سوبھو گیان چندانی، حبیب جالب وغیرہ، حتیٰ کہ پ۔پ۔پ۔ سے تعلق رکھنے والے معراج محمد خان بھی)۔اسی صورتحال کے پس منظر میں حبیب جالب نے اپنی مشہورِ زمانہ نظم ''لاڑکانہ چلو ورنہ تھانہ چلو'' کہی تھی۔دوسری طرف اسی عرصہ کے دوران جناب بھٹو مذہبی اور قدامت پسند تنظیموں اور لیڈروں کو راضی کرنے کے جتن کرتے رہے۔نہ صرف ان کی مرضی کے قوانین بنائے لیکن ان کو 'منانے' کے لئے ذاتی طور پر ان کی چوکھٹ پر بھی گئے۔بہت لوگوں کا خیال ہے کہ

آج جو مذہبی انتہا پسندی کی خطرناک صورتحال پیدا ہوگئی ہے اس کے لئے میدان ہموار قراردادِ مقاصد کے ذریعے لیاقت علی خان نے کیا، اس کی بنیادیں ذوالفقار علی بھٹو نے ڈالیں اور ان بنیادوں پر ایک 'شاندار' عمارت ضیاء الحق نے تعمیر کی۔

جنرل ضیاء نے اپنے ناجائز اقتدار کو جائز بنانے کے لئے اور اسے طول دینے کے لئے مذہب کا جو استعمال کیا اس کی بابت کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ سندھی میں ایک کہاوت ہے کہ "چوٹ کے گواہ زخم ہوتے ہیں"۔ اُس نے اور اس کے 'رفقاء' نے مذہب کی تلوار سے پاکستانی سماج کی جو کاٹ پیٹ کی اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے زخموں سے ابھی تک خون رِس رہا ہے۔ روایتی سیاسی پارٹیوں پر بندشیں ڈال کر اس نے ملک کے اندر عوام کے پیسے سے جو مدرسوں کے جال بچھائے اور پڑوسی ممالک میں مجاہدین کے ذریعے مداخلت کی اس کا منطقی نتیجہ آج ہمارے سامنے یہ ہے کہ 95 فیصد مسلم اکثریت والے ملک میں مسجدوں، مدرسوں اور امام بارگاہوں کے اندر انسانوں کے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں جن کا غیر مسلم اور غیر ملکی حکمرانوں کے وقت میں تصور بھی نہیں تھا۔

جنرل ضیاء الحق کے آمرانہ، جابرانہ، متشددانہ اور فرقہ وارانہ طرزِ حکومت کے خلاف پاکستان کے روشن خیال، امن پسند اور جمہوریت پسند لوگوں نے بہت بڑی جدوجہد کی اور زبردست قربانیاں دیں اور جنرل کی موت کے بعد 1988ء میں ہونے والے انتخابات اس بنیاد پر ایک قسم کا ریفرینڈم تھے۔ ان میں لوگوں نے مذہبی تفریق اور تشدد پر مبنی پالیسیوں کو رد کرتے ہوئے ان سیاسی جماعتوں کو ووٹ دیئے جو سیکولر چہرا رکھنے والی تھیں (مولانا فضل الرحمان کی چند سیٹوں کے علاوہ کوئی مذہبی جماعت کامیابی حاصل نہیں کرسکی)۔ لیکن افسوس کہ اس الیکشن میں یا اس کے بعد والی الیکشنوں میں منتخب ہونے والی حکومتوں نے وہی جنرل ضیاء والا نظام جاری رکھا۔

انہوں نے آمرانہ حکومت کے بنائے ایک بھی قانون کو تبدیل نہیں کیا جبکہ اہم ریاستی معاملات میں وہی پرانی پالیسیاں جاری رکھی گئیں بلکہ کچھ حالتوں میں تو ان میں اضافہ کیا گیا، جیسے محترمہ بینظیر بھٹو کی پہلی حکومت کے دوران اسلام آباد میں امریکا کے کہنے پر افغانستان میں لڑنے والے 'مجاہدین' کی جلاوطن حکومت قائم کی گئی جبکہ ان کے دوسرے دورِ حکومت میں طالبان کو تیار کیا گیا۔اس طرح مذہبی بنیاد پرستی بڑھتی گئی جس کا نشانہ خود محترمہ بھی بن گئیں اور لبرل سیاستدان اور روادار مذہبی عالموں کے قتل کی صورت میں یہ سلسلہ جاری ہے۔

اب پاکستانی ریاست اور معاشرہ جس مذہبی انتہا پسندی کی لپیٹ میں ہے اس کے پس منظر میں ایک طرف حکمرانوں کا ریاستی پالیسیوں کو مذہبی رنگ دینا ہے اور دوسری طرف جی۔ایم۔سید کی سیکولرازم، رواداری اور برابری پر مبنی فکر اور ریاست کو مذہبی بنانے میں پنہاں خطرات کے بارے میں ان کے خدشات اور پیش بینی ہیں۔ ویسے تو سید نے ان معاملات کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا لیکن 1952ء میں آسٹریا کے شہر ویانا میں ہونے والی عالمی امن کانفرنس میں کی گئی ان کی تقریر ایک تاریخی اور یادگار تقریر ہے۔مختصر اقتباس پیش ہیں۔

سیاست میں مذہبی انتہا پسندی کے بڑھتے رجحان پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس سوچ کی بالادستی کی صورت میں ''......چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے، زنا کے ملزم کو سنگسار کیا جائے گا اور مذہبی معاملات میں مختلف خیال رکھنے والوں کو قتل کیا جائے گا۔'' اور مذہبی انتہا پسندوں کی حکومت میں ''جمہوریت اور آزادی اظہار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی اور مذہب کے بارے میں ان کی تشریح کے مطابق دولت کی غیر مساوی تقسیم اور طبقاتی تفریق جائز ہوگی۔'' مستقبل پر نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا ''......ابھی تک حکومتی اہلکاروں نے ان مذہبی گروپوں کے

مطالبات نہیں مانے ہیں لیکن خدشہ ہے کہ پین اسلام ازم اور متحدہ مشرقِ وسطیٰ کے مطالبات سے اور قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے سے رجعت پسند پروپیگنڈا کا زور بڑھے گا اور ہو سکتا ہے کہ یہ نام نہاد مذہبی گروہ حکمرانوں کو ڈرانے دھمکانے میں کامیاب ہو جائیں اور حکمران ان کے نظریات اور مطالبات کے آگے جھک جائیں۔''

سید اور حکمرانوں کے بیچ بنی صف بندی میں اقتداری سیاست کرنے والی پارٹیاں تو حکمرانوں کے ساتھ رہی ہی ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ چند کو چھوڑ کر باقی 'روشن خیال اور ترقی پسند' سیاستدان، لکھاری، صحافی اور دانشور بھی سید کے مخالف اور حکمرانوں کے قریب رہے ہیں۔ آج مذہبی انتہاپسندی کے حوالے سے پیدا ہونے والی صورتحال کے پس منظر میں تجزیہ کیا جائے اور فیصلہ کیا جائے کہ صحیح کون تھا اور غلط کون اور کس کے خیالات اور پالیسیاں عوام دوست اور جمہوریت کے مفاد میں تھیں اور کس کی اس کے منافی۔ اور آج 2011ء کے میڈیا کے دور میں اس سوال کا جواب ڈھونڈنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہر بات صاف اور واضح پڑی ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ ''ہاتھ کنگن کو آئینہ کیا دکھانا۔''

نہ صرف پاکستانی حکمران لیکن عالمی سامراجی طاقتیں بھی اپنے وقتی مفادات کی خاطر پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک میں مذہبی قوتوں کی حمایت اور مدد کرتی رہی ہیں۔ ان کے بارے میں جی۔ایم۔سید نے اُسی امن کانفرنس میں کہا ''جناب چیئرمین! یہ کانفرنس امن کے عظیم مقصد کو آگے بڑھانے کی کوشش ہے۔ میں اس کانفرنس کے مندوبین کو عمومی طور اور برطانیہ اور امریکا کے نمائندوں کو خصوصی طور پر احساس دلانا چاہوں گا کہ امریکی اور برطانوی حکومتیں مسلمانوں کو ان کے 'مذہبی نظریوں' کی بنیاد پر متحد کرنے کی جو کوششیں کر رہی ہیں وہ خطرناک امکانات سے بھری ہوئی ہیں۔'' آج امریکا اور برطانیہ ماتم کر رہے ہیں کہ ''مذہبی بنیاد پرستی دنیا

کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے" اور یہ کہ "اسلامی انتہا پسندی کو اسلام کی اصلی روح سے علیحدہ کرنے کی ضرورت ہے"۔ کاش پاکستان کے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ عالمی 'سپر پاور' بھی سید کے خدشات اور مشوروں پر کان دھرتے۔

تیسرا اہم شعبہ جس کے بارے میں جی۔ایم۔سید اور پاکستان کے حکمرانوں کے خیالات اور حکمت عملیوں میں فرق تھا وہ ہے خارجہ پالیسی۔ سید کا کہنا تھا کہ پاکستان کو چاہئے کہ پڑوسی ممالک سے تعلقات کو اولیت دے اور جنگ، دشمنی اور کشمکش کی پالیسی کے بجائے امن، دوستی اور تعاون کے اصولوں پر عمل کرے۔ اس کے جواب میں حکمرانوں نے سید کو بھارت اور سوویت یونین کا ایجنٹ قرار دے کر جیل اور نظر بندی میں رکھا اور خود ہزاروں میل دور امریکا اور برطانیہ سے دوستی کے دعوے کرتے رہے جبکہ مغرب اور مشرق کی سرحدوں سے متصل پڑوسیوں کی طرف دشمنی والی پالیسیاں اختیار کیں۔ ان میں خارجہ پالیسی کے ماہر کہے جانے والے ذوالفقار علی بھٹو بھی شامل تھے جنہوں نے اپنی سیاست کی بنیاد ہی بھارت دشمنی پر رکھی۔ ان کے مشہور جملے ہر کسی کو یاد ہیں کہ "بھارت سے ہزار سال تک جنگ لڑیں گے" اور "گھاس کھائیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔" دوسری طرف افغانستان کے اندرونی معاملات میں پاکستان کی طرف سے ریاستی سرپرستی میں باقاعدہ منظم مداخلت کی شروعات بھی جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہوئی جب سردار داؤد کی حکومت کے خلاف مذہبی بنیاد پرستوں کو منظم کرنے کی کوشش میں گلبدین حکمت یار کو انجینئرنگ کالج سے نکال کر پشاور کے تربیتی کیمپ میں ٹھہرایا گیا۔

امریکا سے دوستی کرنے اور اس سے امداد لینے کے بدلے میں تیسری دنیا کے کئی دوسرے ممالک کی طرح پاکستان نے بھی امریکا کو اپنی سرزمین پہ فوجی اڈے دیئے۔ اس صورتحال اور اُس کے امکانی نتائج پر بھی جی۔ایم۔سید نے ویانا کی امن کانفرنس

میں روشنی ڈالی تھی۔ ایک جگہ انہوں نے کہا: ''ہم سب جانتے ہیں کہ کئی عالمی طاقتیں ہیں جو مسلمانوں کو اور مسلم ممالک کو مستقبل کی جنگ میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہیں، وہ جنگ جس کو یہ قوتیں اپنے سامراجی مقاصد کے حصول کے لئے ناگزیر اور ضروری سمجھتی ہیں۔'' ایک اور جگہ کہا: '' مجھے انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ کئی مسلم ممالک سامراجی طاقتوں کی فوجوں کو اپنے اڈے فروخت کر رہے ہیں۔ ایسے معاہدوں سے کیا نتائج برآمد ہوں گے اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہمارے یہ ممالک غیر ملکی افواج کے ان کی سرزمین پر موجودگی کی صورت میں بے بس بنے ہوں گے اور ان کی خودمختاری ختم ہو جائے گی۔''

اب جائزہ لیں کہ 63 سالہ خارجہ پالیسی کے نتیجے میں پاکستان کہاں کھڑا ہے۔ آدھی صدی سے زیادہ پہلے جی۔ایم۔سید کی طرف سے بتائے گئے امکانات اور ظاہر کئے گئے خدشات حقیقتوں کا روپ دھار کر حکمرانوں کے سامنے کھڑے ہیں اور اختیار کی گئی پالیسیوں کے نتیجے میں پاکستان خطے میں بالکل تنہا کھڑا ہے اور اپنی بقاء کے لئے امریکا کی طرف دیکھ رہا ہے جبکہ امریکا اپنے اقتصادی اور مالی مفادات کی خاطر اور علاقائی حکمت عملیوں (Geo-strategics) کی خاطر دن بہ دن ہندوستان کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ بات یہاں تک جا پہنچی ہے کہ ''ملکی سلامتی اور تحفظ'' کے نام پر بنائے گئے اور طاقت کی علامت تصور کئے جانے والے ایٹمی ہتھیاروں کو 'محفوظ' بنانے کی پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ سائیں جی۔ایم۔سید نے پاکستان میں گذاری اپنی زندگی کا پہلا نصف پاکستانی حکمرانوں کو راہِ راست پر لانے اور پاکستانی ریاست کو درست بنیادوں پر کھڑا کرنے کی کوششوں میں صرف کیا۔ لیکن جیسا تاریخ میں ہوتا آیا ہے کہ بندوق پر انحصار کرنے والے عقل کی بات نہیں سنتے۔ اسی طرح

پاکستان کے 'حکمرانوں'، ان کے ہمنوا سیاستدانوں اور پاکستان کے 'خیرخواہ' دانشوروں نے معقولیت کی آواز سننے اور اس کے مطابق خود کو تبدیل کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے تعصب، نفرت، تفریق، جنگی جنون اور بالادستی کی سوچ کے ساتھ تیار کئے گئے راستے پر آگے ہی بڑھتے رہے۔ اس مرحلے پر سید نے قرآن کے ان الفاظ سے راہنمائی لیتے ہوئے کہ "یہ اندھے، بہرے اور گونگے ہو چکے ہیں"، اپنا راستہ تبدیل کیا اور اپنی ساری توجہ، ساری توانائی اور تمام وسائل سندھی قوم کی آزادی، خودمختاری اور خوشحالی حاصل کرنے اور سندھ کے راستے سے عالمی امن، بھائی چارے اور بنی نوع انسان کی ترقی کی منزل تک پہنچنے کی جستجو پر صرف کرنے لگے اور اپنی باقی زندگی اس مقصد کو حاصل کرنے اور اس منزل تک پہنچنے کی کوششوں میں گذار دی۔

(17 جنوری 2011ء کو جناب جی۔ایم۔سید کی سالگرہ کے موقعہ پر لکھا گیا)

1948ء میں پاکستان پیپلز آرگنائزیشن کے قیام کے وقت خطبہ استقبالیہ

جی۔ایم۔سید

سندھ کے عوام کی طرف سے میں آپ سب کو سندھو کی اس قدیم سرزمین پر خوش مدید کہتا ہوں جو آج پاکستان کی اس نئی ریاست میں اہم مقام رکھتی ہے۔ یہی جگہ ہے جہاں ہماری مختلف قوموں کی تقدیر تشکیل پائے گی اور یہی جگہ ہے جہاں ان کی حقیقی آواز کا موثر اظہار ہونا چاہئے تاکہ نئے آئین میں ان کے لئے اور آنے والی نسلوں کے لئے مکمل انصاف اور جمہوری مساوات کو یقینی بنایا جا سکے۔

دوستو! سندھ کے لوگ ایک منفرد تاریخ کے وارث ہیں اور یہ ایک فطری بات ہے کہ وہ اتنے ہی شاندار مستقبل کی خواہش کریں باوجود اس کے کہ اس وقت ان کے سروں پر کالے بادل منڈلا رہے ہیں۔ سندھ قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ رہی ہے جس کا ثبوت موہن جودڑو ہے۔ یہاں کئی نسلوں اور کئی مذاہب کا میلاپ ہوا ہے لیکن اس کے باوجود صدیوں کے اس سفر کے دوران سندھ نے اپنا منفرد تشخص برقرار رکھا ہے۔ دراوڑی، آریائی، سامی اور منگول نسلوں کے لوگوں کی آمد اور آبادکاری کے

نشانات یہاں واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن مختلف مذاہب اور مکاتبِ فکر جنہوں نے اس سرزمینِ سندھو پر مختلف ادوار میں اپنا ظہور کیا ان کی یکجہتی نسلوں کے اس میلاپ سے بھی آگے بڑھ گئی۔

بدھ کے مذہب نے اگرچہ جنم ہند کی سرزمین پر لیا لیکن وہ اتنا اور کہیں نہیں پھلا پھولا جتنا اس دھرتی پر۔ نروناَ (ترکِ نفس) کی بدھ کی تعلیم نے سندھ کے لوگوں کے کردار پر گہرے نقوش چھوڑے۔ اسلام جو سب سے پہلے سندھ میں آیا اُس نے اثبات (خود شناسی) کا اضافہ کیا جو ہمارے لوگوں کی روح میں بس گیا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ویدانیت کی تعلیم اور وحدانیت کے فلسفے کا میلاپ ہوا۔ وحدانیت نے ہندو یوگی کو متاثر کیا اور بتوں کی پوجا آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی۔ دوسری طرف مسلم درویشوں نے سنیاسی طریقوں کو اور موسیقی کو اپنے فائدے میں استعمال کیا۔ ہندو اور مسلم کلچر ایک دوسرے میں ضم ہوئے اور ایک سندھی کا عمومی کردار صوفی مزاج سے لبریز ہوا جس کا لازوال اظہار عظیم شاہ عبداللطیف کی شاعری میں کیا گیا ہے جو شاہ ولی اللہ دھلوی کے ہمعصر اور ان کے عظیم شاگرد مخدوم محمد معین ٹھٹوی کے دوست تھے۔ شاہ لطیف اس بین المذاہب یکجہتی کی علامت ہیں جو سندھ کی دھرتی میں پنہاں ہے اور جس کا متبادل اس وسیع برصغیر میں کہیں نہیں ملے گا۔

یہ ہمارے سندھ کے لوگوں کا عظیم ورثہ رہا ہے جس کو بدقسمتی سے پچھلے چند ماہ کے واقعات * سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ نفرت اور جذباتیت کے ایک بڑے اور برے طوفان نے پورے برصغیر کو ہلا کے رکھ دیا ہے اور سندھ بھی اُس کی تباہ کاریوں سے نہیں بچ سکا ہے۔ لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ تاریخی شورش کے ان سیاہ ترین

---

* یہاں جناب جی۔ایم۔سید کا اشارہ 6 جنوری 1948ء کو کراچی سے شروع کئے گئے مذہبی فسادات کی طرف ہے۔

لمحات میں بھی سندھ کے سپوتوں نے کمزوروں اور لاچاروں کے لئے امن، محبت اور سخاوت کی اپنی صدیوں پرانی روایات کو ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا۔ اگر ہمارے اپنے کچھ ہم وطنوں کو اس دھرتی سے بے دخل ہونا پڑا اور کچھ کرائم سرزد ہوئے تو اس انتہائی غیر اسلامی اور انصاف کے منافی عمل سے سندھ کے لوگوں کا کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے بجائے ہمارے لوگوں کا، ایک منفرد کلچر والی جداگانہ قومیت کے طور پر شعور اعلیٰ ترین سطح کو پہنچا ہوا تھا اور اس نئے ملک میں اپنے جائز مقام کی حاصلات کی جدوجہد میں اس میں لازمی طور پر اضافہ ہی ہوگا۔

سندھ تاریخ میں کئی مختلف النوع ادوار سے گذری ہے اور اس دھرتی کو کئی مختلف لوگوں نے میدانِ جنگ بنایا ہے۔ دہلی کی مغل سلطنت کے علاوہ بابل، مصر، ایران، یونان، عربستان اور افغانستان نے بھی اپنے تسلط کو وادی سندھ کے اس زیریں خطے تک بڑھایا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ سندھ کا ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا، لیکن ایک مرتبہ پھر وہ ابھرا پہلے سے زیادہ چمک دمک کے ساتھ اور فتح حاصل کی۔ سندھی ہمیشہ بہترین پڑوسی رہے ہیں لیکن غیر لوگوں کے جابرانہ اور مطلق العنان قبضے کو وہ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ انہوں نے باہر کی اچھی چیزوں کو ہمیشہ قبول کیا ہے لیکن صدیوں کے اس سفر میں انہوں نے کبھی بھی اپنی شناخت نہیں کھوئی۔ ہمارے لوگوں کا حب الوطنی کا جذبہ اور ان کا آزادی اور خودداری سے لگاؤ یہ دونوں مل کر سندھ کی تاریخی روایات کو جنم دیتے ہیں۔

دوستو! سندھ اور اس کے باشندوں کے ساتھ یہ تعارف ضروری ہے اگر ہم پاکستان کی ریاست کی ترقی اور استحکام کو درپیش اہم اور فوری سیاسی مسائل کو بہتر طور پر سمجھنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ کسی صوبائی سطح کی محدود اور تنہا قوم پرستی نہیں بلکہ ایک عظیم قوم کا حقیقی اور غیر متنازعہ ورثہ ہے جو انگریز راج سے حاصل کردہ

آزادی کی تازہ صبح میں اپنا تاریخی کردار ادا کرنے کے لئے بے تاب ہے۔ اور اگر ایک اچھے اور خوشحال پاکستان کے تصور میں ہم واقعی ایماندار اور جمہوری ہیں تو ہم سندھی قوم کی حب الوطنی کی ان روایات کو نئے ملک کے وسیع مفادات سے ہم آہنگ پائیں گے۔ صرف باہمی احترام اور برابری کا احساس ہی مختلف قوموں کو ایک وسیع دائرے میں سما سکتا ہے اور ان میں اجتماعی بھلے کے لئے مشترکہ جدوجہد کا جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔

اپنی ارتقاء کے طویل سفر میں انسان کی منزل عالمی بھائی چارہ رہا ہے اور خیال اور عمل کی یکسوئی ہی وہ قوت ہے جو اس مقصد کی طرف اسے بڑھاتی رہی ہے۔ تمام مذہبی، سیاسی اور اقتصادی جدوجہدیں اس مشترکہ مقصد تک پہنچنے کے مختلف طریقے ہیں۔ تاریخ کے ایک ایک صفحے پر ترقی کا یہ ارتقائی عمل لکھا ہوا ہے جس کا راستہ شروع میں کم لوگوں کو سمجھ میں آتا ہے۔

انسان شروع میں چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے جو وقت گذرنے کے ساتھ آپس میں جڑتے گئے اور قبیلوں اور گروہوں کی شکل اختیار کرتے گئے۔ تہذیب کے ارتقاء کے ساتھ ان قبیلوں نے مل کر جاگیردارانہ ریاست کو جنم دیا جس نے بعد میں ایک مکمل ترقی یافتہ قوم کی شکل اختیار کی۔ قوم کی ارتقاء کے جو بھی حالات رہے ہوں، قوم کے مختلف عناصر میں اجتماعی یکجہتی کا احساس پیدا کرنے والی بنیادی وحدت کو جنم دینے والے اجزا مشترکہ زمین، زندگی کا ڈھنگ اور مشترکہ اقتصادی مفاد تھے۔ اسی احساس کے تلے یورپ کے لوگ کیتھولک اور پروٹسنٹ کے بندھنوں سے باہر نکل آئے اور خود کو جدید قوموں کی صورت میں منظم کیا۔

تیرہ سو سال پہلے صحرائے عرب سے ایک آواز اٹھی جس نے انسانی وحدت کا اعلان کیا اور مختلف قوموں کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کو وہ کامیابی ملی جو پہلے

کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ مسلمان خود اوپر بتائے گئے مشترکہ سرزمین، زبان، طریقہ زندگی اور اقتصادی اور سیاسی مفادات کی یکسانیت کے اجزا کی بنیاد پر تقسیم ہو گئے۔ اسلامی تصور ایک تصور ہی رہا جس کا اس دنیا کی عملی تقاضوں کے ساتھ کوئی واسطہ نہ تھا۔

اگر اسلام کسی بات کی سب سے زیادہ تلقین کرتا ہے تو وہ نظریے اور عمل میں ہم آہنگی ہے۔ جب تک سماجی انصاف اور مساوات کے بنیادی اصول انسانی سماج میں جڑیں نہ پکڑ لیں، عالمی بھائی چارے کا تصور محال ہے۔ ایک صحیح مسلمان بننے کے لئے ہمیں اپنے اندر ایک روحانی انقلاب لانا ہوگا اور ہماری زندگی نظریے اور عمل کے درمیان یکسانیت کا عملی نمونہ ہونی چاہئے۔ صرف پیدائشی سبب یا کسی مذہبی رسم ادا کرنے سے کوئی صحیح مسلمان نہیں بن سکتا۔ ہم کتنے اسلام کے صحیح پیروکار ہیں اس کا ثبوت وہ زندگی ہے جو ہم اس دنیا میں گذارتے ہیں۔

یہ واضح ہے کہ شرابی اور اوباش، جابر اور استحصالی، راشی اور آمر جن کی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایک دھبہ ہے وہ کسی طرح بھی صحیح مسلمان نہیں ہو سکتے۔ خود کو مسلمان کہنا بہت آسان ہے لیکن پاکیزگی کی وہ منزل حاصل کرنے کے لئے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے جس کا ہمارا مذہب تقاضا کرتا ہے۔ بڑے بڑے بزرگ اور فلسفی بھی خدا سے دعا مانگتے اور عاجزی کرتے کہ صحیح مسلمان بننے سے پہلے ان کو موت نہ آئے۔

آج کی مسلم دنیا میں ہماری حالت پہ یہ فقرہ فٹ آتا ہے۔ ''مسلمانی کتاب میں اور مسلمان قبر میں۔'' اس پستی کے کئی تاریخی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن ایک اہم سبب جو ہندوستانی مسلمانوں پر صادق آتا ہے اس کو مولانا عبیداللہ سندھی کے الفاظ میں ہم اس طرح پیش کر سکتے ہیں:

''ہندوستانی مسلمان نے اپنے لئے ایک ایسے تشخص کی خیالی تصویر اختراع کی ہے جس کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم کئی دہائیوں سے ایک ایسے مسلم سماج کے تصور پر جامد ہو گئے ہیں جس کا بہت سوں کے پاس نہ تو کوئی واضح نظریہ ہے اور نہ ہی دنیا میں کہیں اُس کا وجود ہے۔ ہم نے خود کو ایسی خیالی دنیا میں بند کر دیا ہے کہ ہم نہ صرف دوسرے مسلمان ملکوں کی حالیہ تاریخ اور آزادی اور بہتر مستقبل کے لئے ان کی جدوجہد سے کٹ گئے ہیں، لیکن خود اپنے ملک میں اپنی حیثیت کے بارے میں ہماری کوئی واضح سوچ نہیں ہے۔''

ترکی، عربستان، ایران اور افغانستان جیسے آزاد مسلم ممالک بھی اپنی منفرد علاقائی اور زبانی خصوصیات کی بنیادوں پر جدا جدا وجود رکھتے ہیں اور اگر کبھی وہ مل کر ایک عظیم تر وفاق بناتے ہیں تو وہ یقینی طور پر مکمل برابری اور قومی حق خود ارادیت کی بنیاد پر ہوگا۔

یہ اسلام کی تعلیمات کے منافی نہیں ہے۔ اگرچہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جو انسانوں کو متحد کرنا چاہتا ہے لیکن وہ مختلف قوموں کے وجود کو نظرانداز نہیں کرتا۔ قوم مشترکہ ماحول، زبان اور معاشی ضروریات کی بنیادوں پر مشترکہ مفادات کی افزائش کا نام ہے۔ اسلام قوموں کے درمیان صرف ان دیواروں کی تعمیر سے منع کرتا ہے جو مستقل فساد اور تلخیوں کا باعث ہوں۔ ایسی ہی ایک دیوار جس نے انسانی تاریخ کو خون سے رنگ دیا ہے وہ ہے قومی یا نسلی غرور اور چھوٹی اور کمزور قوموں کو ختم کرنے کے لئے ہتھیاروں اور تعداد کے زور پر جارحیت۔

پاکستان کی نئی ریاست میں پٹھانوں، بلوچوں، پنجابیوں اور بنگالیوں کی طرح سندھی بھی ایک جدا اور منفرد قومیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے منفرد کلچر اور روایات کے ساتھ ہر قومیت کی اپنی ایک تاریخ ہے اور ہر قومیت اپنی اس منفرد حیثیت میں

پاکستان کے استحکام اور ترقی میں اپنا بہترین کردار ادا کر سکتی ہے۔لیکن ایسی مشترکہ کوشش کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہر اکائی اپنی ذہنی صلاحیتوں کے مطابق اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے میں خود کو مکمل طور پر آزاد محسوس کرتی ہو۔کوئی مرکزی حکومت کبھی ترقی نہیں کر سکی ہے اگر وفاقی اکائیاں ہر وقت اپنی سلامتی اور اپنے طریقہ زندگی میں مرکزی مداخلت کے خطرے سے دوچار رہیں۔

اس لئے یہ خود پاکستان کے مفاد میں ہوگا کہ پیپلز آرگنائزیشن اس اصول پر زور دے کہ مرکز میں تمام اکائیوں کے ساتھ مکمل برابری کی بنیاد پر سلوک کیا جائے اور اس کی انتظامیہ اور مقننہ میں نمائندگی آبادی کی بنیاد پر نہیں بلکہ تہذیبی اکائیوں کے درمیان برابری کی بنیاد پر ہو۔اس سے ان اندرونی تضادات اور کشمکش کے امکانات کو ختم کیا جا سکے گا جو غیر مساویانہ نمائندگی کے نتیجے میں آخرکار پیدا ہوں گے جب بڑی اکائیاں اپنی عددی برتری کی بنیاد پر چھوٹی اکائیوں پر بالادستی حاصل کرنے اور ان کا استحصال کرنے کی کوشش کریں گی۔

(ملک کی) ترکیبی اکائیوں (Constituent Units) کی اندرونی خودمختاری اور آزادی کو یقینی بنانے کے لئے مشہورِ زمانہ قراردادِ پاکستان پر مکمل طور اور ایمانداری سے عمل کرنا ہوگا۔اس کا وابستہ حصہ یوں ہے:

''آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کا یہ طے شدہ موقف ہے کہ کوئی بھی آئینی منصوبہ اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوگا جب تک وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی نہیں ہوگا، یعنی جغرافیائی اعتبار سے ملحق و متصل وحدتوں (Units) کی خطوں (Regions) کی صورت میں مناسب علاقائی ردو بدل کے بعد اس طرح حد بندی کی جائے کہ وہ علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، جیسا کہ ہندستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصوں (Zones) میں ہے،

آزاد مملکتوں کی شکل اختیار کرلیں جن میں ترکیبی وحدتیں (Constituent Units) آزاد (Sovereign) اور خود مختار (Autonomious) ہوں۔"

یہ تاریخ کی شرمناک دھوکے بازی ہوگی اگر مسلم لیگ، اب اقتدار میں آنے کے بعد، اپنے ہی وعدوں سے انحراف کرتی ہے اور اپنے اس حلف کی خلاف ورزی کرتی ہے جس کی بنیاد پر اس نے مختلف صوبوں کی حمایت حاصل کی۔ تمام صوبوں میں سندھ آخری صوبہ ہوگا جو اپنے آپ کو باہر کے طالع آزماؤں کے لئے ایک چراگاہ بننے دے گا جو اس کے اقتصادی وسائل کا استحصال کرنا چاہتے ہوں اور اس کو سیاسی اور ذہنی طور پر مغلوب کرنا چاہتے ہوں۔ جہاں تک ہندستان سے آنے والے حقیقی مہاجرین کا تعلق ہے تو سندھ کی روایتی مہمان نوازی اور فیاضی سے وہ مکمل طور پر مستفیض ہو رہے ہیں لیکن یہ بھی ایک فطری بات ہے کہ ہم ان سے توقع کرتے ہیں کہ وہ سندھی قوم میں اپنے آپ کو ضم کریں، ان کے زبان اور کلچر کو اختیار کریں اور سندھ کے اجتماعی مفادات کو اپنا مفاد سمجھیں۔

جب سندھی مسلمانوں نے پاکستان کے لئے جدوجہد کی، اور یہ جدوجہد انہوں نے 1940ء کی قراردادِ لاہور سے بھی پہلے کی تھی، تو وہ انگریز اور ہندو بالادستی سے آزاد ہونا چاہتے تھے اور حقیقی فرزندانِ سرزمین کی حیثیت میں بااختیار بننا چاہتے تھے۔ انہوں نے باہر کے ہندو مستقل مفاد کی سندھ کے معاملات میں مداخلت کی مخالف کی جو ان کی سیاسی اور اقتصادی غلامی کو دوام دینا چاہتے تھے۔

لیکن 1945ء میں باہر کے مسلم مستقل مفاد کا خطرہ بھی نظر آنے لگا تھا جو نظریہ لیگ کے پردے میں سندھ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ سندھ کو وہ اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے لئے آسان شکار سمجھتے تھے۔ میری جماعت آزاد پاکستان میں آزاد سندھ چاہتی تھی اور ایسا کرتے ہوئے وہ سندھ کے غریب عوام کی اندر کی خواہشات اور

احساسات کا اظہار کر رہی تھی۔ سندھ میں کٹر سے کٹر مسلم لیگی بھی جدوجہد کے نتیجے میں صرف آقاؤں کی تبدیلی نہیں چاہتا تھا۔ یہ کوئی تشفی کی بات نہیں ہے کہ ہم ہندو کی اطاعت سے نکل کر ہم مذہبوں کی غلامی میں آجائیں۔ غلامی غلامی ہے اور جب تک یہ موجود رہتی ہے تو غلام کا یہ فطری حق ہے کہ وہ اپنے کو آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کرے۔ اگر آج ہم سندھی عوام کو محرومی اور محکومی کے ایک گہرے احساس میں مبتلا دیکھتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ ایمانداری سے اور ٹھنڈے دماغ سے بنیادی اسباب کا جائزہ لیں، نہ کہ پوری قوم کو تنگ نظر صوبائیت کا طعنہ دے کر ان کی مذمت کریں۔ یہ ہمارے جیسی ایک نوزائیدہ ریاست کی ترقی میں مدد دینے کا طریقہ نہیں ہے جو مختلف زبانیں بولنے والی اور مختلف طریقہ زندگی اختیار کئے ہوئے مختلف قوموں پر مشتمل ہے۔ ان کی مشترکہ قوت اور صلاحیت کا صرف اسی صورت میں بامقصد استعمال کیا جاسکتا ہے جب ہم ہر قومیت کی ناقابلِ تردید انفرادیت اور اس کے مخصوص مسائل سے شتر مرغ کی طرح منہ چھپانے کی بجائے ایمانداری سے موجودہ اختلافات اور تضادات کے اسباب کو تسلیم کریں۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستان ایک مسلمان ملک ہے، لہٰذا شروع سے ہی تمام صوبائی سوچوں اور سرحدوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے ایک سخت قسم کی مرکزیت پسند ریاست کی تشکیل کی جائے۔ یہ ایک الگ حقیقت ہے کہ ایسا تجربہ ابھی تک کسی بھی مسلم ملک میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان واقعی ایک صحیح مسلم ملک ہے جو اسلام کے اصولوں کے مطابق چل رہا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو مسلمانوں کے آپس میں جھگڑے اور اختلافات نہیں ہوتے اور نہ ہی بے اطمینانی اور کشمکش کی موجودہ صورتحال ہوتی۔ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ایسا آئیڈیل سماج موجود نہیں ہے اور نہ ہی ہوسکتا ہے جب تک ہم اُس اتحاد اور یکجہتی کا مظاہرہ نہ کریں

جس کا عملی ثبوت ہمارے پیغمبر نے دیا تھا۔

اتنا بڑا مقصد ایسے افراد کے ٹولے کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتا جن کے اپنے مادی مفادات ان محنت کش مسلم عوام کے اجتماعی مفادات سے متضاد ہیں جنہوں نے پاکستان حاصل کرنے کی جدوجہد میں سب سے زیادہ تکلیفیں برداشت کیں اور اگر رشوت اور بے ایمانی کی وہ بدبو اسلام کا خمیر ہے جو پاکستان بننے کے ساتھ پھیلنا شروع ہوگئی ہے تو پھر میں یہ کہوں گا کہ اسلام کے مقدس نام پر لوگوں کو بیوقوف بنایا جارہا ہے، ان لوگوں کو جو طاقتور اور چالاک حکمران ٹولے کا حصہ نہیں ہیں۔

دوستو! ہم ایک عبوری دور سے گذر رہے ہیں جہاں ایک طرف حکمران گروہوں کا اپنا جائزہ لینے کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تو دوسری طرف عوام میں مصیبتوں اور مشکلات کے نتیجے میں بہت بڑا شعور اور بیداری آرہی ہے۔ان کو پاکستان پہ اعتبار کرنا سکھایا گیا ہے اور وہ اب بھی اس پر اعتبار کرنا چاہتے ہیں لیکن انسانی بھائی چارے اور سماجی انصاف کے گہوارے کی حیثیت میں۔مگر جن حقیقتوں کا ان کو سامنا ہے وہ ان میں ناامیدی اور بے اطمینانی پیدا کررہی ہیں۔

ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ پاکستان کی نئی ریاست کو کئی رکاوٹوں کا سامنا ہے اور اس میں کافی وقت لگے گا کہ ہم وہ استحکام حاصل کرنے کے قابل ہوسکیں جو اس کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ضروری ہے۔لیکن ہم جو اس ریاست کے شہری ہیں ان کے ذہن بھی صاف ہونے چاہئیں کہ ہم کس طرح کا سماج تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اندرونی مضبوطی اور یکجہتی کے لئے پاکستان کو ایک جمہوری ملک بننا ہوگا جہاں تمام شہریوں کو برابر کے حقوق اور برابر کے مواقع حاصل ہوں۔ایک صحت مند جمہوریت تب تک نہیں پنپ سکتی جب تک لوگوں کو اظہار

اور تنظیم کاری کی مکمل آزادی نہ ہوتا کہ عوام ان کے مفادات کو متاثر کرنے والے مسائل کا تنقیدی جائزہ لینے کے قابل ہوسکیں اور ان مسائل کے بارے میں اپنا نقطہ نگاہ آزادی سے پیش کرسکیں۔

لیکن پارلیمانی جمہوریت اپنے طور پر کوئی بڑا مقصد حاصل نہیں کر سکے گی جب تک وہ اپنا دائرہ کار اقتصادی معاملات تک نہیں بڑھاتی جن کا تعلق عام آدمی کے زندگی اور موت کے مسائل سے ہوتا ہے۔ ہماری پارٹی، اگر وہ واقعی عوام کی پارٹی ہے اور عوام کے لئے کام کرنا چاہتی ہے تو اسے سماج کی سوشلسٹ تعمیر کے لئے واضح موقف لینا ہوگا جو نہ صرف اسلام کی تعلیمات کی روح ہے بلکہ تیزی سے وقت کی ضرورت بنتی جارہی ہے۔

سوشلزم واحد معاشی نظام ہے جو کمزور طبقوں کو مکمل انصاف فراہم کرسکتا ہے اور پسماندہ لوگوں کے مفاد میں تیز اور منصوبہ بند صنعتکاری کے لئے ریاست کی تمام پیداواری قوتوں کو متحرک کر سکتا ہے۔ آج ہماری ساری قومی دولت چند نوابوں، جاگیرداروں اور نئے صنعتکاروں کے ہاتھوں میں ہے جن کی ریاست سے وابستگی محض دولت اور کرسی کی لالچ کی وجہ سے ہے۔ ہمارے باقی سارے لوگ 'ادنیٰ' مزدوروں کے ایک بڑے ہجوم کی طرح غلامانہ زندگی گذار رہے ہیں۔ اتنی بڑی ناہمواری اور استحصال کی صورتحال کو فوراً ختم ہونا چاہئے ورنہ انتشار اور بدحالی کی موجودہ صورتحال سنگین تر ہوتی جائے گی جو آخرکار ایک پُرتشدد انقلاب اور تباہ کن معاشی شورش کو جنم دے گی۔ ہم طاقتور عالمی قوتوں کے دائرہ کار سے مستثنیٰ نہیں ہیں اور عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم وقت کے ساتھ چلیں۔

ہم جانتے ہیں کہ موجودہ حکمران گروہ کے اکثر ممبر عوام کی خوشحالی اور مستقبل سے تعلق رکھنے والے ان انتہائی اہم جمہوری مسائل کو اٹھانے پر ناراض ہوتے ہیں۔ تنقید

کرنے والوں کی وفاداری پہ سوال اٹھانا اور ان کو'ایجنٹ' قرار دینا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔لیکن ہمارے ملک کی سیاست کو جذبات ابھار کر اور تعصبات کو ہوا دے کر ہمیشہ کے لئے نہیں چلایا جا سکتا۔اب جبکہ خود ہمارے حکمرانوں کے الفاظ میں ہمارا ملک اندرونی اور بیرونی طور سنگین بحران سے دوچار ہے، یہ پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ ان نابالغ لوگوں کے سیاسی کردار کو سنجیدہ دلائل، غیر جذباتی فہم وفراست اور مستحکم جدت کی طرف موڑا جائے۔صرف اسی صورت میں ہماری نئی ریاست ایک پائیدار کردار کی حامل بن سکتی ہے۔

ہماری پارٹی ایک روایتی سیاسی پارٹی نہیں ہے جس کا مقصد محض پاور پالیٹکس کرنا اور الیکشنی شعبدہ بازیوں میں ملوث ہونا ہو۔ ہمارے پیچھے محرک قوت ملک اور اس کے عوام کی خدمت اور قربانی کے اعلیٰ آدرش ہیں۔ کرسی کی دوڑ اور سیاسی سازشیں ہمارے اسلحہ خانے کے ہتھیار نہیں ہیں۔ یہ ہتھیار ہم ان لوگوں کے لئے چھوڑتے ہیں جو ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمارا واحد دفاع عوام خود ہیں جن میں ہمیں مکمل بھروسہ ہے۔ ہماری مدد وحمایت ہر اس شخص کو حاصل ہوگی جو عوام کی بھلائی کے کام کرے گا۔ ہم بلا خوف وخطر ہر اس فرد پہ تنقید کریں گے جو جان بوجھ کر عوام کے مستقبل کو داؤ پر لگائے گا چاہے وہ کتنے ہی اعلیٰ عہدے پر فائز کیوں نہ ہو۔ہم پرانے جھگڑوں کو دل میں نہیں رکھتے اور نہ ہی ہماری کسی سے ذاتی دشمنی ہے۔عوام کا مفاد کسی بھی فرد سے بالاتر ہے اور ہماری ذاتی زندگی سے بھی خدمت کے اس تعمیری جذبے کا اظہار ہونا چاہئے۔

کسی بھی ریاست کی تعمیر اور استحکام میں سب سے اہم عنصر عوام ہوتے ہیں۔ ہماری نئی مملکت کی مستقبل کی ترقی اور خوشحالی کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ پاکستان کے عوام اپنے ملک کے دفاع اور عظمت کے لئے، آزادی سے اور خود ور طریقے سے،

کیسے متحد ہوتے ہیں۔

پاکستان اپنی پیدائش کے دن سے یکے بعد دیگرے بحرانوں سے گذر رہا ہے۔ اپنی مصیبتوں اور مشکلات پر قابو پانے اور پُرامن ترقی وتعمیر کے مرحلے میں داخل ہونے میں ہمیں کتنا عرصہ درکار ہوگا اس کا مکمل دارومدار اس بات پر ہوگا کہ ہم پاکستان کے عوام، ورثے میں ملی ذمہ داری کو مشترکہ طور پر اٹھانے اور مستقبل کے راستے پر اعتماد اور یقین کے ساتھ چلنے کے لئے کتنا تیار ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے راستے کے سب سے بڑے خطرے کی جڑیں ہماری قومی زندگی میں ہیں: باہمی نفرت اور شکوک وشبہات، بے حسی اور بیگانگی، کاہلی اور غیر واضح سوچ، اقتدار کے نشے اور عدم برداشت کا خطرہ۔ اگر ہم اپنے لئے ایک درخشاں مستقبل کی تعمیر میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اسی خطرے کے خلاف جنگ کرنی ہوگی۔

دنیا کی نظریں ہم پر لگی ہوئی ہیں، وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم کس طرح اپنے آپ کو نو حاصل کردہ آزادی کا اہل ثابت کرتے ہیں اور امن اور جمہوریت کی قوتوں کو مضبوط کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اور ہمارے اپنے مصیبتوں کے مارے عوام کی آنکھیں فکرمندی سے منتظر ہیں کہ کس طرح یہ نئی مملکت اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرتی ہے اور اپنے شہریوں کو حقیقی امن اور انسانی بھائی چارے کی پناہ گاہ مہیا کرتی ہے۔

پاکستان پیپلز آرگنائزیشن اس لئے وجود میں آئی ہے کہ ان تمام ترقی پسند اور عوامی قوتوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کیا جائے جو عوام کی تیزی سے بڑھتی بیداری کی پیداوار ہیں اور جن کی مضبوطی ہی ہمارے ملک کے تحفظ اور ترقی کی سب سے بڑی گارنٹی ہوگی۔ اس آرگنائزیشن کا مقصد صرف ایک ہے، ہمارے ملک کو

درپیش اہم مسائل کو معقولیت سے اور عوام کے نقطہ نگاہ سے سمجھیں اور ان کے حل کے لئے ہمت اور بے خوفی سے آگے بڑھیں۔

یہ بدقسمتی ہے کہ کچھ لوگ ابھی سے ہماری تنظیم پر تنقید کر رہے ہیں جن کو ہماری ان کوششوں سے غداری کی بو آ رہی ہے جو ہم اس نئی ریاست کے لئے حمایت حاصل کرنے اور کروڑوں محنت کش عوام کے دل و دماغ میں اس کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔ اس سے اس ملک میں جمہوری اداروں کی پرورش اور استحکام میں کوئی مدد نہیں ملے گی، اور نہ ہی یہ کوئی مدبرانہ رویہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اقتدار میں آنے والی پارٹیاں اور افراد حب الوطنی پر اپنی اجارہ داری جتاتے ہیں اور قوم کے مفادات کو اپنے ذاتی اقتدار اور استحقاق کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

ہم یہ تاریخ پر اور اپنے ملک کے عوام پر چھوڑتے ہیں کہ وہ ہماری پالیسی اور ہمارے عمل کے بارے میں فیصلہ دیں۔ ہمیں اپنی حب الوطنی پر غیر متزلزل یقین ہے جو ہم نے محلاتوں اور طاقت اور دبدبے کے مرکزوں سے نہیں بلکہ غربت کی جھونپڑیوں اور جدوجہد سے حاصل کی ہے اور جس میں ہمارے ہم وطنوں کی بہت بڑی اکثریت زندگی بسر کر رہی ہے اور یہ ہماری مشکلات اور قربانیوں کا ریکارڈ ہی ہوگا جو ہماری اپنی جنم بھومی سے وفاداری اور ہماری حب الوطنی کا سب سے بڑا سرٹیفکیٹ ہوگا۔

نئی آرگنائزیشن کے دروازے ہر اس پاکستانی شہری کے لئے، قطع نظر برادری اور طبقے کے، کھلے ہوں گے جس کو ہمارے عوام کی منزلِ مقصود میں مکمل یقین ہو اور جو اُس شاندار مستقبل کی تعمیر میں اپنا حصہ ایمانداری سے اور پختہ عزم سے ادا کرنے کو تیار ہو جس کے حصول کے لئے دنیا کی تمام آزاد اور جمہوری قومیں

جدوجہد کر رہی ہیں۔

دوستو! میں ایک مرتبہ پھر آپ کو کراچی میں خوش آمدید کہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کا تبادلہ خیال اور جدوجہد کا حتمی پروگرام ہمارے عوام کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کریگا۔

پاکستان پیپلز آرگنائزیشن کا سیاسی پروگرام اور لائحہ عمل

جی۔ایم سید

بہت عرصے کے غور و فکر کے بعد یہ ضروری ہو گیا ہے کہ "پاکستان پیپلز آرگنائزیشن" کی بنیاد ڈالی جائے تاکہ پاکستان کے مستقبل سے وابستہ مسائل کے حل کے لئے عام آدمی کے نکتہ نظر کو آگے بڑھایا جائے۔

سب سے پہلے یہ واضح ہونا چاہئے کہ ہماری تنظیم کا مقصد بلاشبہ اس ریاست کا تحفظ اور استحکام ہے جو کہ ہمارا اجتماعی ورثہ بھی ہے اور ایک مقدس فریضہ بھی جو ہمیں آئندہ آنے والی نسلوں کے مفادات کی خاطر سونپا گیا ہے۔ اس کو صحیح معنی میں ایک شاندار ریاست بنانے کے لئے ہمیں زیادہ سے زیادہ قربانی اور محنت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

اس تجویز پر پوری ایمانداری سے غور کیا گیا کہ تمام ترقی پسند قوتوں کو مسلم لیگ پارٹی کا ساتھ دینا چاہئے۔ لیکن پاکستان کی خوشحالی میں دلچسپی رکھنے والے دوسرے عناصر کے نکتہ نظر کو بھی دیکھنا ضروری ہے جس کے مطابق موجودہ حالات میں مسلم لیگ نہ صرف اپنی افادیت کھو چکی ہے لیکن اس کا ترمیم شدہ نظریہ بھی ایسا ہے کہ وہ لوگ جو عوام کے حقیقی مسائل اور تکالیف اور ان کے حل میں دلچسپی رکھتے ہیں ان

کے لئے یہ جماعت کوئی انسپائریشن مہیا نہیں کرتی۔

ان حالات میں ترقی پسند قوتوں کو مسلم لیگ میں ضم کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں ہوگا کہ کنفیوژن میں مزید اضافہ ہو، موجود مسائل کے حل کے اس ترقی پسندانہ طریقے میں مزید تاخیر ہو جس کا غریب عوام کو شدت سے انتظار ہے اور ان برائیوں کو مزید مستحکم کیا جائے جن کی وجہ سے ماضی قریب میں حالات اتنے خراب ہوئے جس کی کوئی مثال نہیں۔

پیپلز آرگنائزیشن قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک متبادل فکر، ایک متبادل پروگرام پیش کیا جائے جس میں ہمارے عوام کے مسائل کا حقیقی حل ہو۔

ہم پاکستان کو خودمختار سوشلسٹ جمہوریاؤں کا اتحاد (Union of Autonomous Socialist Republics) بنانا چاہتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ انسان انسان کے درمیان مکمل اقتصادی برابری سے ہی فطری تقاضاؤں کی تکمیل ہوگی، اور اس عمل میں رکاوٹ ڈالنے یا تاخیر کرنے کی کوئی بھی کوشش انسانی مصیبتوں میں اضافے کا باعث ہوگی۔ پاکستان میں عوام غربت، جہالت اور طبقاتی بالادستی کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اقتصادی یا سیاسی ہر قسم کے غلبے اور استحصال کا خاتمہ ہو۔ یہ مقصد تب تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ریاست کے تمام شہریوں کو مساوی مواقع اور مساوی حقوق مہیا نہ کئے جائیں۔

نہ ہی کسی ریاست کے استحکام کو تب تک یقینی بنایا جا سکتا ہے جب تک اس کی ترکیبی اکائیوں (Constituent Units) کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ اپنے آدرشوں کی تکمیل کے لئے مکمل طور پر اور ہر طرح سے آزاد ہیں۔ کسی قسم کی ناانصافی یا مرکز کی غیرضروری مداخلت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اکائیاں ریاست کی مجموعی ترقی کے عمل سے لاتعلق یا کن حالات میں تو اس کی مخالف بن جائیں گی۔ اس اندرونی جھگڑے اور مختلف

اکائیوں کے تصادم کو روکنے کا جمہوری طریقہ یہ ہے کہ پاکستان کو آزاد سوشلسٹ جمہوریاؤں کا اتحاد (Union of Free Socialist Republics) بنایا جائے جس میں ہر جمہوریہ کو برابری اور خود ارادیت کے مکمل حقوق حاصل ہوں۔

مزید یہ کہ جب ہم جمہوریہ کے اصول کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کو غیر ملکی اثر سے آزاد اور پاک صاف رکھیں چاہے وہ اثر سیاسی بالادستی کی شکل میں ہو یا اقتصادی غلبے کی صورت میں۔ ہماری جو جائے وقوع ہے، تو صرف مکمل آزادی کا احساس ہی ہماری قوم کو یہ ترغیب اور طاقت دے سکتا ہے کہ وہ اپنے مشن کی مکمل حاصلات کر سکے اور اپنے ملک کو غیر ملکی رقابتوں اور سازشوں کی ایک نئی آماجگاہ بننے سے بچا سکے۔

ہماری تنظیم، جیسا کہ اس کے اغراض و مقاصد سے ظاہر ہوگا، اپنی بناوٹ اور اپنے اظہار میں ایک قومی تنظیم ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ مخصوص اور غیر معمولی حالات میں فرقہ واریت کو جائز سمجھتے ہوں لیکن کسی صورت بھی ایک آزاد اور خود مختار ریاست میں اس کی جگہ نہیں بنتی کیونکہ جس لمحے اس ریاست نے اپنی فلاحی سرگرمیوں کا مرکز کسی مخصوص فرقے یا گروہ کو بنایا تو اس لمحے اس کا بحیثیت ایسے ادارے کے کردار ختم ہوجائے گا جو اپنے عوام کی اجتماعی توقعات اور خواہشات اور عالمگیر ترقی اور خوشحالی کے لئے کام کر سکے۔

خاص کر کے آج کی جدید دنیا میں ایسی ریاست امنِ عالم اور ترقی بنی نوع انسان کے مقصد کی حاصلات کی بجائے صرف نفاق اور پھوٹ کو جنم دے گی جس کا نتیجہ لڑائی جھگڑا اور مصیبت وتباہی ہوگا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری ریاست کا ایسا انجام ہو اور اسی لئے ابتدا سے ہی ہم نے اپنی تنظیم کے دروازے ایسے تمام لوگوں کے لئے۔ بغیر ذات اور برادری کے فرق کے کھول دیئے ہیں جو اس کے نظریے سے اتفاق

کرتے ہوں۔ مصیبت اور بدنامی کو جنم دینے والے اس برے چکر کو کہیں نہ کہیں سے ختم کرنا ہے اور ہماری خواہش ہے کہ پاکستان اس معاملے میں پیش قدمی کرے۔ ہماری تنظیم کی سوچ کے مطابق پاکستان میں اقلیتوں کو شہریت کے برابر حقوق اور ثقافتی اور تعلیمی ترقی کے برابر مواقع حاصل ہوں گے کیونکہ یہ گناہ ہوگا کہ کسی انسان کو اس کے مخصوص مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر نااہل قرار دے دیا جائے۔

ہم اپنے تمام پڑوسیوں سے، بشمول بھارت، امن کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ اپنی ریاست کی سالمیت کو قربان کئے بغیر ہم پاکستان اور بھارت کے درمیان دوستانہ تعلقات کے فروغ کے لئے ہر وہ کام کریں گے جو ہمارے بس میں ہوگا کیونکہ بھارت کے ساتھ ہمارے قریبی رشتے ہیں اور اس کے تعاون کے بغیر یہ برصغیر عالمی معاملات میں اپنا صحیح کردار ادا نہیں کرسکتا۔

ہم نے اپنے پروگرام میں مہاجرین کے مسائل کو اعلیٰ ترجیح دی ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ لوگوں کو ان کے گھروں سے بے دخل نہ کیا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہماری کوشش ہوگی کہ جو لوگ اپنے گھروں سے بے دخل ہو چکے ہیں ان کو دوبارہ آباد کیا جائے۔ اس کے بغیر مستقبل میں ایک لمبے عرصے تک پاکستان اور بھارت مہاجر مسئلے میں پھنسے رہیں گے اور دونوں تب تک کوئی ترقی نہیں کرسکیں گے جب تک ایک ملک سے دوسرے میں ہجرت کرنے والے لاکھوں انسانوں کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ بہر حال اگر کچھ حالات میں اس اصول (مہاجرین کی واپسی) کا اطلاق نہیں ہوتا، ہماری پارٹی کی پوری کوشش ہوگی کہ مہاجر بھائیوں کی اِدھر ہی معمول کی زندگی شروع کرنے میں مدد کی جائے۔ ہم ایسی حکمت عملی کے بارے میں سوچ رہے ہیں جس کے ذریعے یہ تنظیم مہاجر بھائیوں کی جتنی ممکن ہو مدد کر سکے۔

15 اگست 1947ء کو آزادی کا سورج طلوع ہونے اور پاکستان بننے سے

پورے برصغیر میں عمومی طور پر سکھ کا سانس لیا گیا۔ برطانوی راج کے ماتحت ہمارے لوگوں کی غلامی کا طویل اور افسوسناک باب ختم ہوتا نظر آرہا تھا۔ پاکستان کی اس نئی ریاست کے قیام سے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ طویل عرصے تک مصیبتیں جھیلنے والے ہمارے لوگوں کے لئے باہمی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور پُرامن ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا تھا۔

آزادی کا سورج جس کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں نے اتنے لمبے عرصے تک انتظار اور جدوجہد کی تھی وہ آخرکار طلوع ہوگیا تھا۔ ہمارے سامنے روشنی اور نئی زندگی کا ایک ایسا دور تھا جو ماضی کی صدیوں کی زنجیروں سے آزاد ہو۔

لیکن، افسوس! کہ ہماری آزادی کی اس فیصلہ کن تاریخ کے بعد جو حالات پیدا ہوئے انہوں نے ان تمام پُرجوش امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ جو سورج طلوع ہوا تھا، ایسا نظر آرہا تھا کہ وہ اپنی تپتی کرنوں سے اس برصغیر کے بڑے حصے کو آگ لگا رہا تھا جہاں شدید نفرت اور بے مقصد بربادی کا دور دورہ تھا۔ جو لوگ ابھی ''آزاد'' ہوئے تھے وہ، ایسے لگ رہا تھا کہ باہمی قتل غارتگری، تباہی، آتشزنی اور عصمت دری کے لئے اس آزادی کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں تک کو نہیں بخشا جارہا تھا اور ہندو مسلم تضاد حتمی حل کی طرف بڑھنے کی بجائے ایسا نظر آرہا تھا کہ ایک مستقل جھگڑے کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا جو ہمارے سادہ اور فراخ دل لوگوں میں موجود انسانیت اور شائستگی کی بنیادوں کو پراگندہ کررہا تھا۔

دونوں ممالک کی اقلیتوں پر جو آفت ٹوٹی اس کی وجہ سے اتنے بڑے پیمانے پر لوگوں نے ہجرت کی جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ اچانک اور پُرتشدد طوفان کا نشانہ بننے والے اور وسیع پیمانے کی جنونیت اور نفرت کے شکار ان بے یار و مددگار انسانوں کو اپنے آبائی گھروں سے اکھاڑ کر ایک نامعلوم اور غیر یقینی

مستقبل کے لئے انجانے ماحول میں، انجانے لوگوں کے ہاتھوں میں پھینک دیا گیا۔ اس تباہ کن اور بڑی ہجرت کے دونوں ممالک کی سماجی اور اقتصادی زندگی پر پڑنے والے اثرات کا حتمی اندازہ لگانا ابھی مشکل ہے۔

پچھلے نو ماہ کے واقعات اگر ایک طرف لاکھوں انسانوں کے لئے صحیح معنی میں ایک عذاب ثابت ہوئے تو دوسری طرف ان سماج دشمن عناصر کے لئے ایک آسان شکارگاہ مہیا ہوئی جو دوسرے انسانوں کی مصیبتوں سے اپنی زندگی میں خوشیاں بھرتے ہیں۔ رشوت اور کرپشن تمام حدود پار کرگئی ہے۔ ہر چیز کی وافر مقدار ہونے کے باوجود قحط، سمگلنگ اور کالے دھندے کے کثیر الرخی سانپ نے ایک دفعہ پھر سر اٹھایا ہے جو قومی معاشیات کی بنیادوں کو تباہ کر دے گا۔ وہ تمام اخلاقی اقدار جو ایک مہذب معاشرے کی تشکیل کرتی ہیں وہ ختم ہو رہی ہیں۔ جس وقت اسلام اور ہندوازم کے نام پر لڑائیاں لڑی جا رہی تھیں تو مذہب کی حقیقی نشانیوں اور ہمارے لوگوں کے کردار میں روحانی اقدار کو وحشی جذبات کے عشرت کدے اور خسیس مفادات کی بھینٹ چڑھایا جارہا تھا۔

لوگوں نے آزادی کے لئے جدوجہد کی اور اپنے نمائندوں کو اقتدار تک پہنچایا تاکہ ایک نئے دور کا آغاز ہو سکے۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ نوکر شاہی برطانوی راج کے بدترین دنوں سے بھی زیادہ گستاخ اور غیر ذمہ دار ہوگئی ہے۔ ان کی زنجیریں مزید کس دی گئی ہیں۔ بے ایمانی اور اقربا پروری زندگی کا معمول بن گئی ہیں جبکہ سیاسی اقتدار کو ذاتی مفادات اور دولت جمع کرنے کا ہتھیار بنا دیا گیا ہے۔

جب فرقہ وارانہ جذبات اور تشدد میں کمی آنے لگی تو نئے مسائل کھڑے کئے گئے تاکہ عوام کو گمراہ کیا جا سکے۔ جب بھوک اور افلاس اس دھرتی پر چھائی ہوئی تھی تو دونوں ممالک کے درمیان ممکنہ جنگ کے بادل لوگوں کے سروں پر منڈلانے

لگے خاص کر کے ان اکثریتی عوام کے جن کی قسمت کا فیصلہ ایسی تباہی کے ہاتھوں ہو جاتا تھا۔ اس طرح ہر آنے والا دن گزرنے والے سے زیادہ خطرناک اور غیر یقینی بنتا گیا۔

یہ ہے 15 اگست کو طلوع ہونے والے آزادی کے سورج کی مختصر کہانی۔ سورج کا جتنا لمبا انتظار تھا اتنی ہی اس کی کرنیں بے رحم اور عذاب دینے والی ثابت ہوئیں۔

یہ کس کا قصور تھا___ کہ وہ قیمتی آزادی جس کی خاطر اَن گنت شہیدوں نے اپنے بے بہا خون کا نذرانہ دیا، اس کو ایسا بدصورت بنا دیا گیا؟

کیا یہ وہ قائدین تھے جو یہ نہ سمجھ سکے کہ اصل میں ان کی منزل ہے کیا؟

دنیا نے چھ طویل برسوں تک ایک خوفناک جنگ کو جھیلا۔ امن اور جمہوریت کی خاطر دنیا کو محفوظ بنانے کی کوشش میں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں نے پوری دنیا میں پھیلے جنگی میدانوں میں اپنی جانیں قربان کی۔ فاشزم کی ابھرتی ہوئی قوتوں کے خلاف مشترکہ جدوجہد کے لئے اتحادی قوتیں مجبور ہوگئی تھیں۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ شانہ بہ شانہ کھڑے تھے تاکہ وہ ہٹلر کی یلغار کو روک سکیں اور آزادی کی شمع کو جلتا رکھ سکیں۔

ہٹلر تو مر گیا، لیکن اُس کی روح زندہ رہی اور اُس نے اُن لوگوں میں دوبارہ جنم لیا جنہوں نے اُس (ہٹلر) کے خلاف جنگ کی تھی۔

جنگ تو ختم ہوگئی تھی، لیکن امن اب بھی نظروں سے دور تھا۔ ساری دنیا میں کئی غیر سرکاری جنگیں لڑی جا رہی تھیں جبکہ تیسری عالمگیر جنگ کا خطرہ سروں پر منڈلا رہا تھا۔

یہ کس کا قصور تھا۔ امن کے چہرے کو مسخ کرنا، وہ امن جس کے قیام کے لئے کروڑوں انسانوں نے شدید جنگ لڑی اور اپنی قیمتی جانیں قربان کیں؟

پاکستان کی یہ نئی ریاست مسلم لیگ کے اُس مطالبے کے نتیجے میں وجود میں آئی جو مطالبہ اس برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کی امنگوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ایک مکمل ریاست کے طور پر وجود میں آنے سے پہلے پاکستان کے حق میں یا مخالفت میں جو بھی دلائل تھے، لیکن اس نئی صورتحال نے ان تمام لوگوں پر بھاری ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں جو اس وقت پاکستان کے باشندے ہیں۔ان ہی لوگوں کے مفادات کی خاطر اور ان کی آنے والی نسلوں کی خاطر اس نئی ریاست کی تشکیل اور تعمیر کرنی ہے۔

شاید ہی کن لوگوں نے مقصد کی حاصلات کے لئے اتنا خون بہایا ہو جتنا مسلمانوں نے پاکستان کے لئے بہایا ہے۔اگرچہ پاکستان کے حصول کے بعد بھی ان کی قربانیاں جاری ہیں، لیکن اس کو انصاف اور بھائی چارے کا گہوارہ بنانے کا عام مسلمان کا خواب نئی ریاست کے معماروں کے ذہن اور ضمیر کے لئے ہمیشہ ایک چیلنج رہے گا۔

اسلام کے اعلیٰ اصولوں سے روشنی لیتے ہوئے پاکستان بطور مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست، ہمارے پسماندہ سماج کی نئے سرے سے تعمیر کے لئے ایک تجربہ گاہ ثابت ہوسکتا ہے۔

دفاعی حکمت عملی کے لحاظ سے عالمی سیاست کے نقشے پر ایک اہم خطہ ہونے کی بنا پر پاکستان کی حیثیت محض برصغیر ہند کے ایک جغرافیائی ٹکڑے کی نہیں ہے۔اندرونی سیاست اور عوام کے جذبات و احساسات میں مطابقت پیدا کر کے پاکستان امن کی ایک مضبوط دیوار بن سکتا ہے اور بڑھتی ہوئی عالمی کشیدگی کو کم کرنے میں اپنا اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

جب 8 مئی کو کراچی میں پاکستان پیپلز آرگنائزیشن کا پہلا کنونشن منعقد ہوا تو وہاں جمع ہونے والے مندوبین کی سنجیدہ توجہ کا مرکز پاکستان اور اس میں رہنے والی

مختلف قوموں کی سلامتی اور خوشحالی سے وابستہ یہ معاملات تھے۔ان سب کو اُس سنگین اور ہنگامی صورتحال کا احساس تھا جس کا اس نئی ریاست کو سامنا ہے اور سب اتنے ہی فکر مند تھے کہ یہ کنونشن کوئی ایسی حکمت عملی وضع کرے کہ اس ریاست کے تحفظ کے لئے پاکستانی عوام کے وسیع تر اتحاد کو موثر طریقے سے عمل میں لایا جا سکے۔

اس تین روزہ بحث مباحثے کے دوران مختلف گروپوں اور مکاتب فکر کی نمائندگی کرنے والے مندوبین کچھ بنیادی اصولوں پر متفق ہوئے جو پاکستان کی تعمیر اور استحکام کے لئے ضروری ہیں۔مختصر طور ان بنیادی اصولوں کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے:

پہلا، پاکستان مکمل طور پر ایک آزاد ملک ہو جس کی طاقت کا سر چشمہ اس کے اپنے عوام ہوں اور جو خود کو ان سامراجی طاقتوں کے بڑھتے ہوئے اثر سے آزاد رکھے جن کا مفاد اسی میں ہے کہ جنگی جنون کی موجودہ صورتحال اور دنیا پر ان کی بالادستی قائم رہے۔اگر پاکستان کو اپنے اقتصادی اور مالی مفاد میں کسی دوسرے ملک سے کوئی معاہدہ کرنا بھی پڑے تب بھی اس کو اپنی سالمیت اور عمل کی آزادی کا کسی غیر ملکی طاقت سے سودا کسی صورت میں نہیں کرنا چاہئے۔صرف ایک آزاد پاکستان ہی اپنے آپ کو اقتدار کی موجودہ رسہ کشی کی دلدل سے بچا سکتا ہے اور ایک اور (عالمی) جنگ کے ممکنہ خطرے کو ٹالنے میں اپنا مناسب کردار ادا کر سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ پاکستان اپنے طور پر انگریز حاکمیت کے خلاف کسی سیدھی (بلاواسطہ) اور کٹھن جدوجہد کا نتیجہ نہ ہو لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بیشمار مسلم محب وطنوں نے آزادی کے لئے اپنے پُر جوش سفر میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔برصغیر میں برطانوی سامراج کے دوسو سالہ دور کے دوران، 1857ء کی جنگِ آزادی میں اور بعد کی تحاریکِ آزادی میں، غیر ملکی قبضے کے خاتمے کے لئے

مختلف قوموں کی سلامتی اور خوشحالی سے وابستہ یہ معاملات تھے۔ ان سب کو اس سنگین اور ہنگامی صورتحال کا احساس تھا جس کا اس نئی ریاست کو سامنا ہے اور سب اتنے ہی فکرمند تھے کہ یہ کنونشن کوئی ایسی حکمت عملی وضع کرے کہ اس ریاست کے تحفظ کے لئے پاکستانی عوام کے وسیع تر اتحاد کو موثر طریقے سے عمل میں لایا جا سکے۔

اس تین روزہ بحث مباحثے کے دوران مختلف گروپوں اور مکاتب فکر کی نمائندگی کرنے والے مندوبین کچھ بنیادی اصولوں پر متفق ہوئے جو پاکستان کی تعمیر اور استحکام کے لئے ضروری ہیں۔ مختصر طور ان بنیادی اصولوں کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے:

پہلا، پاکستان مکمل طور پر ایک آزاد ملک ہو جس کی طاقت کا سرچشمہ اس کے اپنے عوام ہوں اور جو خود کو ان سامراجی طاقتوں کے بڑھتے ہوئے اثر سے آزاد رکھے جن کا مفاد اسی میں ہے کہ جنگی جنون کی موجودہ صورتحال اور دنیا پر ان کی بالا دستی قائم رہے۔ اگر پاکستان کو اپنے اقتصادی اور مالی مفاد میں کسی دوسرے ملک سے کوئی معاہدہ کرنا بھی پڑے تب بھی اس کو اپنی سالمیت اور عمل کی آزادی کا کسی غیر ملکی طاقت سے سودا کسی صورت میں نہیں کرنا چاہئے۔ صرف ایک آزاد پاکستان ہی اپنے آپ کو اقتدار کی موجودہ رسہ کشی کی دلدل سے بچا سکتا ہے اور ایک اور (عالمی) جنگ کے ممکنہ خطرے کو ٹالنے میں اپنا مناسب کردار ادا کر سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ پاکستان اپنے طور پر انگریز حاکمیت کے خلاف کسی سیدھی (بلاواسطہ) اور کٹھن جدوجہد کا نتیجہ نہ ہو لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بیشمار مسلم محب وطنوں نے آزادی کے لئے اپنے پُرجوش سفر میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ برصغیر میں برطانوی سامراج کے دوسوسالہ دور کے دوران، 1857ء کی جنگِ آزادی میں اور بعد کی تحاریکِ آزادی میں، غیر ملکی قبضے کے خاتمے کے لئے

صورت میں ظاہر ہو۔

جمہوریت ہی عوام کو سیاسی بلوغت اور فیصلے کی قوت حاصل کرنے کا بھرپور موقعہ مہیا کرتی ہے۔مختلف سیاسی پارٹیوں کو آزادانہ اور بغیر رکاوٹ کے عمل کا موقعہ دینے سے ان پر اپنے دعووں کو ثابت کرنے کی ذمہ داری بھی آئے گی اور عوام کو موقعہ بھی ملے گا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے لیڈروں اور نمائندوں کا انتخاب کرسکیں۔جابروں اور غاصبوں کی طرف سے جمہوریت کو ایک غیر ضروری عیاشی کہہ کر رد کرنا ایک فیشن بن گیا ہے لیکن وقتِ حاضر کے تجربات نے بہت اچھی طرح دکھادیا ہے کہ ایک ریاست جو آہنی ڈکٹیٹر شپ کی گھٹن تلے دبی ہوئی ہو وہ کیسے بدقسمتی کے پہلے ہی جھٹکے سے بکھر جاتی ہے۔مطلق اقتدار مطلق کرپشن لاتا ہے اور سماج کے اندر توڑ پھوڑ کو جنم دیتا ہے۔ دنیا کے بہترین ڈکٹیٹر بھی انسانی سماج کے اس بنیادی اصول کے عمل اور اس کے نتائج سے بچ نہیں سکے ہیں۔

تیسرا، پاکستان کو مکمل طور پر خودمختار سوشلسٹ جمہوریاؤں کا ایک وفاق بنانا چاہئے، نہ کہ جدید سرمایہ دارانہ طرز کی انتہائی مرکزیت پسند ریاست جس میں وحدانی طرزِ حکومت ہو اور جہاں مختلف وفاقی اکائیوں کے منصفانہ حقوق کو مکمل طور پر نظرانداز کیا جاتا ہو۔یہ تصور مسلم لیگ کی پاس کردہ قراردادِ لاہور، جس کی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا، اس کی بنیادی روح کے عین مطابق ہے۔ پاکستان، جس کے وسیع علاقے کے اندر بہت سی منفرد قومیتیں رہتی ہیں جن کا اپنا علیحدہ کلچر اور تاریخی پس منظر ہے، اس کے استحکام اور اندرونی امن کے لئے اس اصول کے نہ صرف الفاظ بلکہ اس کی روح پر عمل کرنا ایک بنیادی شرط ہے۔

دورِ حاضر کی تاریخ نے بہت اچھی طرح ثابت کیا ہے کہ کس طرح قومیتوں کا سوال (اگر حل نہ کیا جائے تو کینکر (درختوں کی بیماری) کی طرح ریاست کے اہم اجزا

کو کھا جاتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ عالمی تصادم کو جنم دیتا ہے جب ایک چھوٹی اور محکوم قومیت اپنی نجات کے لئے باہر سے مدد حاصل کرتی ہے۔ اس نکتہ پر سیاسی نظریہ دانوں کے درمیان اختلافات رہے ہیں لیکن یورپ کی ماضی قریب کی تاریخ کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ایک ملک کی بہتری اس میں ہے کہ مختلف قومیتوں کے وجود کو تسلیم کیا جائے جن کے اپنے جدا اور منفرد کلچر اور زبانیں، تاریخ اور روایات، خواہشات اور رجحانات ہیں اور ان کو مکمل اور لامحدود اندرونی خودمختاری اور حق خودارادیت کے ذریعے ان کے مستقبل کا یقین دلایا جائے۔ ایک مسئلہ تب حل ہوگا جب ہمت سے اس کا سامنا کیا جائے اور اس کی وجوہات کو سمجھا جائے، مسئلہ نظرانداز کرنے یا دبانے سے حل نہیں ہوگا جیسے یہ حکمران کرتے ہیں۔

چوتھا، پاکستان کے بطور ایک جدید، غیر فرقہ وار ریاست کے ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی سیاست کو معقولیت کی بنیاد پر آگے بڑھایا جائے جس میں ہر شہری میں تحفظ اور خود اظہاری کے احساس کو یقینی بنایا جائے۔ سیاسی جماعتوں کی تشکیل غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہونی چاہئے جو واضح سماجی اور معاشی مفادات کی نمائندگی کرتی ہوں۔ تاکہ عوام کی توجہ خوف اور نفرت پر مبنی فرقہ واریت کے مصنوعی مطالبات سے ہٹا کر کچھ مثبت اور تعمیری معاملات کی طرف کی جائے جو ریاست اور عوام کی زندگیوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ پاکستان بننے سے پہلے شاید ایک ایسی مذہبی جماعت ضروری ہو جو ایک خاص مذہبی برادری کے سیاسی مقاصد کی نمائندگی کرتی ہو لیکن وہ مقصدِ (پاکستان) حاصل ہونے کے بعد وہ غیر ضروری بن گئی ہے۔ اب یہ پاکستان کی نئی قیادت کا قومی فریضہ بن گیا ہے کہ وہ ان تمام سیاسی دیواروں کو ڈھا دیں جو مذہب کی بنیاد پر ایک شہری کو دوسرے شہری سے الگ کرتی ہوں اور اقلیتی برادریوں کو موجودہ احساسِ کمتری اور عدم تحفظ سے نجات دلائیں جو ان میں یہ احساس اور خواہش

پیدا کر رہے ہیں کہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر پڑوسی ریاست میں پناہ لیں۔

اگر مسلم لیگ کے دروازے دوسری برادریوں کے لوگوں کے لئے بھی کھولے جاتے اور پاکستان کے انتظامی اور سیاسی معاملات میں انہیں مسلمانوں کے مساوی بنیادوں پر تمام مواقع مہیا کئے جاتے تو اقلیتوں کی بڑے پیمانے پر ہجرت کے غیر ضروری المیے سے بچا جا سکتا تھا اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی وفاق میں رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کا بہترین دفاع اسی میں تھا جن کی قسمت کا دارومدار اس رویے پر ہے جو یہاں کی اقلیتوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔

اوپر دیئے گئے اصول ایک مضبوط پاکستان کی تصویر کشی کرتے ہیں جس کی نشو و نما ایک عوامی ریاست کے طور پر ہو۔ یہ پاکستان کے دفاع میں اکٹھے ہونے اور پاکستانی عوام میں اس ریاست کے لئے حب الوطنی اور وفاداری کا جذبہ پیدا کرنے کی خاطر تمام ترقی پسندوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرتے ہیں۔

پاکستان پیپلز کنونشن ایسے وقت میں منعقد ہوا جب اس کے منتظمین کی ایمانداری اور وفاداری کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا جا رہا تھا اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ سنجیدگی اور وفاداری سے پاکستان کی خدمت کرنے کے ان کے جذبے پر صاحب اقتدار لوگوں کی طرف سے سوال اٹھائے جا رہے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس ریاست کو موجودہ بحران سے نکالنے کے مقصد میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے لئے پاکستان کے تمام شہریوں سے، بغیر مذہب اور عقیدے کے فرق کے، سے بار بار اپیل کی ہے۔

بہرحال تعصب پر مبنی پرانے دور کے یہ الزامات منتظمین کو اپنے ملک اور اس کے باشندوں کی خوشحالی کے لئے کام کرنے کے فیصلے سے باز نہ رکھ سکے۔ ان میں سے کئی نے اپنی پوری زندگی ملک اور عوام کی خدمت میں گذار دی تھی اور برطانوی حکمرانوں

کے قید و بند بھی عوام کے لئے آزادی اور انصاف حاصل کرنے کے ان کے جذبے کو متاثر نہ کر سکے۔

جنہوں نے ہماری دعوت کا مثبت جواب دیا ان میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے رہنما اور اس ملک میں مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں کے بانی شامل تھے۔ اقلیتوں کے نمائندوں کے علاوہ ایسے ادیب، دانشور اور جید علماء کنونشن میں موجود تھے جن کے ذہن میں ایک روشن خیال اور ترقی پسند معاشرے کا تصور ہے اور جو پاکستان کو قوموں کی برادری میں اعلیٰ مقام دلانا چاہتے ہیں۔

جس مدبرانہ انداز میں بحث مباحثہ کیا گیا اور پاکستان کے عوام کے آگے عظیم مقاصد کا جس طرح تفصیلی جائزہ لیا گیا اس کا اندازہ کنونشن میں پاس کی گئی قراردادوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

اولین قرارداد میں واضح کیا گیا کہ نئی تنظیم نے اپنے کیریئر کا آغاز محض اہلِ اقتدار کی مخالفت یا وزارتی کرسیوں کی لالچ میں سیاسی سازشیں کرنے کی خاطر نہیں کیا تھا۔ ملک کو درپیش ہنگامی صورتحال کا ادراک کرتے ہوئے پیپلز آرگنائزیشن ایک متفقہ پروگرام پر حکومتی پارٹی سے تعاون کے لئے تیار ہو گی جبکہ ایسے اتفاق کی غیر موجودگی میں بھی حکومت کو اس کے قومی تعمیر کے کاموں میں آرگنائزیشن کی حمایت، تعمیری تنقید کے دائرے میں رہتے ہوئے، حاصل رہے گی۔

دوسری قرارداد کا تعلق مہاجرین کے بہت بڑے مسئلے سے ہے جو شروع دن سے پاکستان کی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ تب تک اس برصغیر میں نہ تو امن ہو سکتا ہے اور نہ ہی ترقی جب تک دونوں ممالک کے درمیان ایک دوستانہ اور پُرخلوص معاہدہ نہیں ہوتا جس میں اقلیتوں کے لئے مکمل تحفظ کو یقینی بنایا جائے اور مطلوبہ پُرامن حالات پیدا کئے جائیں جن میں بے گھر اور بے یار و مددگار

کروڑوں مہاجرین اپنے آبائی گھروں کو واپس ہو سکیں۔ جب تک دونوں پڑوسی حکومتوں کی پالیسیوں سے ایسی خوشگوار صورتحال پیدا ہو تب تک کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ مہاجرین کو ان کے اختیار کردہ صوبوں میں گھر، پُر سکون ماحول اور گذر معاش کے وسیلے مہیا کیئے جائیں۔

کنونشن نے ایک ایسی پیپلز آرگنائزیشن کی بنیاد رکھی ہے جس کے دروازے ایسے تمام حقیقی خدامِ عوام کے لئے ہمیشہ کھلے ہوں گے جو اس ملک میں ایک نئے سماج، نئی اخلاقی قدروں کو جنم دینے کے کام میں اپنا کردار ادا کرنے کو تیار ہو۔ یہ حقیقت کہ لفظ ''پارٹی'' کو ''آرگنائزیشن'' کی مشکل اصطلاح سے تبدیل کیا گیا اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ صرف اقتدار حاصل کرنے کے لئے پارٹی پالیٹکس نہیں ہوگی بلکہ ایک وسیع عوامی تحریک ہوگی جس کا مقصد ہماری بہترین اور اعلٰی روایتوں کو اور ہمارے عوام کے دل و دماغ میں موجود تمام اخلاقی اور ذہنی وسائل کو اُجاگر اور استعمال کرنا ہوگا۔

ہمارے لوگوں میں بڑھتے ہوئے فرسٹریشن اور کنفیوژن کے احساس کی طرف سے آنکھیں بند کرنا یا اسے بیکار کا خیال کہہ کر رَد کر دینا بے ایمانی ہوگی۔ مراعات یافتہ طبقوں میں اخلاقی اور سیاسی اقدار کی تباہی نے عوام میں بے حسی اور بیزاری کا ایک احساس پیدا کیا ہے کیونکہ ان کو ابھی تک اپنے اُس طاقتور کردار کا احساس نہیں ہوا ہے جو وہ اس ملک کی تقدیر بدلنے میں ادا کر سکتے ہیں۔

یہ اور بھی زیادہ بے ایمانی ہوگی اگر آج ہم خاموش رہیں اور عوام کے اس جمود کی وجہ سے ملک کو درپیش خطرات سے انجان رہیں۔ آخر ریاست بھی ہوا میں تو نہیں وجود رکھتی اور نہ ہی یہ مراعات یافتہ طبقے اور رشوت خور نوکر شاہی اس کی اصلی قوت ہیں۔ یہ عام لوگ ہی ہیں جو ریاست کی حفاظت کے لئے اپنا خون پسینہ ایک

کرتے ہیں اوران کے روٹی روزگار کے مسئلے ہی ریاست کی طرف ان کے رویوں کا تعین کرتے ہیں۔

یہ عام لوگ ہی ہوتے ہیں جو اپنے ملک کے دفاع کے لئے جنگ کے میدانوں میں لڑتے اور مرتے ہیں اوران کی خوشی اور خوشحالی ان کی ریاست سے وفاداری کی امین ہوتی ہے۔

پاکستان ان خوابوں کی تعبیر تھا جو کروڑوں مسلمانوں نے اُس سرزمین کے بارے میں دیکھے تھے جس کے بارے میں ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ بھوک اور ناانصافی کے برے سائے سے پاک ہوگی۔آیئے ان کے خوابوں کو تصور اور شرمناک حقیقت کے بیچ میں بڑھتے فرق کی وجہ سے ٹوٹنے سے بچائیں۔اس فرق کو مٹانے اور پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانے کے لئے جس کو عوام کی حمایت مانگنی نہ پڑے بلکہ خود بخود اور مکمل طور پر اسے حاصل ہو۔ساری دنیا میں عوام کا بڑھتا ہوا شعور ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہے جہاں انسان اپنا وقار اور امن حاصل کر سکے۔

1952ء میں ویانا میں منعقدہ
عالمی امن کانفرنس سے خطاب

جی۔ایم۔سیّد

جناب چیئرمین اور مندوبین ساتھیو!

پاکستان سے آئے ہوئے مندوب کی حیثیت میں آپ سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کی عمر پانچ سال سے کچھ ہی زیادہ ہے، لہٰذا میں چاہوں گا کہ آپ کو اس کے بارے میں کچھ بتاؤں۔

14 اگست 1947ء سے پہلے پاکستان برصغیر ہند کا حصہ تھا اور یہ ممکن ہے کہ آپ میں سے بہت سے لوگ اس کے وجود میں آنے کے اسباب اور اس کی ترقی کی تاریخ سے ناواقف ہوں۔ اور اس امکان کی وجہ سے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے اس نئے ملک کے بارے میں کچھ حقائق آپ کے سامنے پیش کروں۔ برصغیر ہند عددی لحاظ سے دو بڑی برادریوں کا مسکن تھا اور وہ دو برادریاں تھیں ہندو اور مسلمان۔ ہندستان میں برطانوی اقتدار قائم ہونے سے پہلے ملک کے بڑے حصے پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اپنی سامراجی پالیسیوں کے تحت انگریزوں نے مسلمانوں کو دبانے کی

کوشش کی جبکہ ہندوؤں کو دوبارہ/بحال کرنے کی شروعات کی اور اس طرح ہندو برادری تعلیم، اقتصادیات اور سیاست کے میدانوں میں طاقتور بنتی اور آگے بڑھتی گئی۔ یہ فطری بات تھی کہ طاقت حاصل کرنے کے ساتھ ہی ان میں قومی معاملات پر اختیار حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ انگریزوں نے اپنے مفادات اور اپنی ضروریات کے تحت پالیسی میں تبدیلی کی اور مسلمانوں کی سرپرستی کرنی شروع کی۔ یاد رہے کہ عددی لحاظ سے مسلمان ہندوؤں کے ایک چوتھائی کے برابر تھے۔ منطقی طور پر انگریزوں کی اس پالیسی کے نتیجے میں دونوں حصوں کے درمیان مذہبی تعصبات اور سیاسی اختلافات نے جنم لیا۔ ایک حصے یعنی پاکستان میں اقتدار مسلمانوں کی بڑی پارٹی مسلم لیگ کو دیا گیا اور دوسرے حصے یعنی انڈیا میں انڈین نیشنل کانگریس کو۔

اگست 1947ء کے اس فیصلے کے وقت یہ توقعات کی جارہی تھیں کہ برصغیر کی تقسیم کے ساتھ تمام فرقہ وارانہ اختلافات ختم ہو جائیں گے اور دونوں ملکوں کے عوام ترقی اور باوقار قومی زندگی کے راستے پر پُر امن سفر کر سکیں گے۔ لیکن افسوس کہ اس تقسیم نے تو فرقہ وارانہ اختلافات کی آگ کو اور ہوا دی اور دونوں ممالک کے لئے سانحات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

خواتین وحضرات! آپ ان سانحات کی شدت کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ تقریباً دس لاکھ افراد کو قتل کیا گیا جب تاریخ کی سب سے احمقانہ ہجرت نے جنم لیا۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ انسانوں کو اپنے آبائی گھر چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں جانا پڑا۔ تقریباً ڈھائی لاکھ خواتین کو زبردستی اغوا کیا گیا۔ کروڑوں کی املاک کو یا تو تباہ کر دیا گیا یا لوٹا گیا یا چھوڑ دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو توقع تھی کہ اتنی بڑی تباہی کے بعد لوگ کچھ سبق سیکھیں گے اور امن اور باہمی ترقی کے لئے کام کریں گے۔ مجھے انتہائی دکھ کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑ رہا ہے کہ قومی زندگی میں کوئی ترقی کرنے کی بجائے ہم ان دونوں ممالک کے

باشندے، ابھی تک باہمی جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ امن جس کی ہمیں جستجو تھی وہ ابھی تک حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ کئی مسائل جو تمام اختلافات اور رنجشوں کی جڑ ہیں ابھی تک حل نہیں کئے جا سکے ہیں جیسا کہ مہاجرین کی بحالی، پانی کا مسئلہ، ہجرت کرنے والوں کی املاک کا معاملہ وغیرہ۔ مواصلات اور تجارت کی پُرامن اور معمول کی بحالی بھی ابھی تک نہیں ہو سکی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر کشمیر کا انتہائی مشکل اور حساس معاملہ جو دو برادر ملکوں کو ایسی جنگ میں دھکیل سکتا ہے جو باہمی تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ ان مسائل کی موجودگی نے دونوں حکومتوں کے درمیان دشمنی کا ماحول پیدا کر دیا ہے اور وہ دفاع جیسے غیر پیداواری معاملے پر ہی وسائل کا بے دریغ اور وحشیانہ زیاں کر رہی ہیں۔ یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ان جھگڑوں نے دونوں ممالک کو سامراجی طاقتوں کی چالبازیوں کے لئے اکھاڑہ بنا دیا ہے جو انتہائی مفاد پرست ہیں اور دوسروں کی مشکلات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد چیئرمین صاحب، میں سامعین کو اپنے ملک کے بارے میں کچھ معلومات دینا چاہوں گا۔

پاکستان دو حصوں میں بٹا ہوا ایک ملک ہے۔ تقریباً 1500 میل کا فاصلہ دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے اور یہ فاصلہ اور کچھ نہیں بلکہ جمہوریہ ہندستان ہے۔ مشرقی پاکستان تقسیم سے پہلے کے صوبہ بنگال کے ایک حصے اور آسام کے ضلع پر مشتمل ہے۔ اس کی اراضی 53920 چو.س میل جبکہ آبادی 4,19,30,000 نفوس پر مشتمل ہے۔ قبل از تقسیم پنجاب کا ایک حصہ، صوبہ سندھ، صوبہ سرحد، بلوچستان اور کچھ پرانی ریاستیں مل کر موجودہ مغربی پاکستان کی تشکیل کرتی ہیں۔ ملک کے اس حصے کی اراضی 310298 چورس میل اور آبادی 3,37,10,000 افراد پر مشتمل ہے۔ 52 فیصد آبادی کا انحصار زراعت پر ہے اور وہ مٹی کے گھروں یا جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ 88 فیصد لوگ اَن پڑھ ہیں۔ پرائمری اسکولوں میں طلباء کی تعداد 3461870،

سیکنڈری اسکولوں میں 1014348 اور پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں 41027 طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس پچاس ہزار افراد پر ایک ڈاکٹر اور اَسی ہزار کی آبادی پر ایک نرس موجود ہے۔ ہماری کل 364218 چورس میل اراضی کے لئے صرف دس ہزار میل روڈ اور چار ہزار میل ریلوے لائن ہے۔ ہمارے لوگوں کی فی کس آمدنی صرف چار روپے ماہانہ ہے۔ ہمارے ملک میں تقریباً ایک کروڑ انسانوں کے پاس مستقل ٹھکانہ نہیں۔

جناب چیئرمین! تقسیم کے وقت برطانیہ نے اقتدار مسلمانوں کی بڑی جماعت مسلم لیگ کو منتقل کیا تھا۔ آج تک وہی پارٹی اقتدار میں ہے۔ پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ گذرنے کے باوجود ابھی تک ہمارے ملک کو نہ تو آئین مل سکا ہے اور نہ ہی قومی قانون ساز ادارے کے انتخابات ہوئے ہیں۔ اقتدار میں بیٹھے لوگوں کا نظریہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان عقیدے کی بنیاد پر ایک قوم ہیں اور یہ کہ خداتعالیٰ نے دنیا کی قیادت کرنے کا مشن مسلمانوں کو دیا ہے۔ اس دنیا میں صرف کیپیٹلزم اور کمیونزم کے دو نظریات ہی نہیں لیکن عالمی افق پر ایک تیسرا نظریہ بھی ہے، اور وہ ہے نظریہ اسلام۔ اسی پس منظر میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کی طرف سے قراردادِ مقاصد پاس کی گئی جو اس طرح ہے:

''اللہ کے نام سے جو مہربان اور رحم کرنے والا ہے:

چونکہ تمام دنیا پر اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس نے اپنا اختیار پاکستان کی ریاست کو، اس کے عوام کی معرفت، منتقل کیا ہے جس کو اس کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر استعمال کرنا ایک مقدس فریضہ ہے:

پاکستان کے عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے آئین ساز اسمبلی پاکستان کی آزاد اور خودمختار ریاست کے لئے ایک آئین بنانے کا عہد کرتی ہے:

جہاں ریاست اپنے اختیارات اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کی معرفت استعمال کرے گی:

جہاں اسلام کے بتائے ہوئے جمہوریت، آزادی، برابری، برداشت اور سماجی انصاف کے اصولوں پر سختی سے عمل کیا جائے گا:

جہاں مسلمانوں کو موقعہ ہوگا کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو قرآن اور سنت کی بتائی ہوئی تعلیمات اور ضروریات کے مطابق ڈھال سکیں:

جہاں اقلیتوں کو سہولت ہوگی کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کر سکیں۔ نیز وہ اپنے تمدن کی نشوونما اور جائز مفادات کا تحفظ کرنے کا اہتمام بھی کر سکیں گی۔

اس وقت جو علاقے پاکستان میں شامل ہیں یا اس کے بعد اس سے وابستگی اختیار کریں گے ایک فیڈریشن کی تشکیل کریں گے جس میں اکائیاں (Units) خودمختار ہوں گی لیکن ان کے اختیارات پر متعین کردہ پابندیوں اور حد بندیوں کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے۔

جہاں قانون اور عمومی اخلاقیات کے دائرے میں بنیادی حقوق کو یقینی بنایا جائے گا جن میں قانون کے سامنے حیثیت اور مواقع کی برابری، سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف اور خیال، اس کے اظہار، مذہب، عقیدے، عبادت اور تنظیم کی آزادی ہوگی:

جہاں اقلیتوں اور کمزور اور دبے ہوئے طبقات کے جائز مفادات کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں گے:

جہاں عدلیہ کی آزادی کو یقینی بنایا جائے گا:

جہاں وفاق کی علاقائی سالمیت، اس کی آزادی اور اس کے حقوق، بشمول زمین، سمندر اور ہوا پر اس کے مکمل حقوق کا تحفظ کیا جائے گا:

تاکہ پاکستان کے عوام خوشحال ہو سکیں اور دنیا کی اقوام کے درمیان اپنا جائز اور

باوقار مقام حاصل کرسکیں اور عالمی امن اور ترقی اور انسانذات کی خوشیوں میں اپنا حصہ ادا کرسکیں۔''

موجودہ وقت میں پاکستان کی قیادت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو برطانوی طرز کی سیکولر جمہوریت میں یقین رکھتے ہیں۔ لیکن نظریہ پاکستان اور مسلمانوں کے جدا قوم ہونے کے اصول کے ساتھ ساتھ قراردادِ مقاصد کی روح اور الفاظ نے مسلم لیگ کے اندر اور اس سے باہر لازمی طور پر لوگوں کے ایسے گروہ پیدا کردیئے ہیں جو موجودہ حکومت کو ایسی پالیسیاں اختیار کرنے کے لئے مجبور کررہے ہیں جو ایک مذہبی ریاست کو جنم دیں گی جو ہر وقت بھارت کے ساتھ حالتِ جنگ میں رہے گی۔

اس بات سے انکار نہیں کہ ابھی تک یہ رجعت پسند اور انتہائی قدامت پسند عناصر اپنی ان کوششوں میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں اور صاحب اقتدار لوگوں نے ہتھیار نہیں پھینکے۔ ساتھ ہی اس بات سے بھی انکار نہیں کہ غربت اور عوام کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے، بیروزگاری میں اضافے کی وجہ سے، دونوں ممالک کے درمیان بڑھتے ہوئے شکوک وشبہات اور اختلافات کی وجہ سے عوام حالات سے مطمئن نہیں ہیں۔ حکومت کی طرف سے کیے گئے کئی غیر دانشمندانہ اقدامات کی وجہ سے بھی بہت سے لوگ غیر مطمئن ہیں۔ اس بات کے بہت امکانات ہیں کہ رجعت پسند اور نیم مذہبی عناصر اس صورتحال سے فائدہ اٹھائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اقتدار میں آجائیں۔ یہ حالات یقینی طور پر ہمیں ترقی نہیں، پستی کی طرف لے جائیں گے۔ بہت سے لوگ جو مذہب کو اپنی طاقت کا ذریعہ سمجھتے ہیں ان کی رائے ہے کہ ہمیں انگلش۔ رومن عدالتی نظام ختم کردینا چاہئے اور اس کی جگہ پہ قرونِ وسطیٰ کے متروکہ قوانین نافذ کیے جائیں جن کے مطابق چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے، زنا کے ملزم کو سنگسار کیا جائے گا اور مختلف مذہبی خیالات رکھنے والے لوگوں کو قتل کیا جائے گا۔

حکومت کی باگ ڈور نام نہاد مذہبی لیڈروں کے ہاتھ میں ہوگی (جنہیں ہمارے ملک میں مُلّا کہا جاتا ہے)اور وہ اسے اپنے مذہبی عقائد کی تشریح کے مطابق چلائیں گے۔ ایسی مذہبی حکومت میں جمہوریت اور اظہارِ آزادی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ اپنی تشریح کے مطابق وہ پہلے ہی قومی دولت کی غیر مساوی تقسیم اور طبقاتی تفریق کو جائز اور قانونی قرار دے چکے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ موجودہ عدالتوں کو ختم کر دیا جائے اور انصاف کا کلیسائی نظام نافذ کیا جائے۔ بینکوں کا بھی خاتمہ چاہتے ہیں۔ دنیا کی قیادت کے حصول اور اسلام کے غلبے کی کوشش میں وہ 'جہاد' کی تبلیغ کریں گے اور مسلمانوں کو ایک جنگجو اور شاونسٹ سماج میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ یہ تمام بین الاقوامی پالیسیاں اور کوششیں جو پین۔ اسلامزم اور مشرقِ وسطیٰ کے اتحاد کی حمایت کرتی ہیں درحقیقت ان مذہبی گروہوں کی خواہشات اور توقعات کو مضبوط کر رہی ہیں جو ہماری قومی زندگی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ایسی بہت سی عالمی قوتیں ہیں جو مسلمانوں اور مسلمان ملکوں کو اُس آنے والی جنگ میں ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہیں جو ان کے خیال میں ان کے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لئے نہ صرف ناگزیر بلکہ ضروری بھی ہے۔

مجھے انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ملک کو بھی مسلم دنیا کے لیڈروں کے سنہرے وعدوں سے لبھایا جا رہا ہے اور ان غیر ملکی طاقتوں کی طرف سے استعمال کیا جا رہا ہے جن کا مسلمان ممالک میں بڑا سیاسی اور اقتصادی اثر رسوخ ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہماری حکومت کے قائدین نے ابھی تک ان مذہبی گروہوں کے مطالبات کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ لیکن ہمیں خدشہ ہے کہ پین۔ اسلامزم اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے اتحاد کے مطالبات سے اور قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے سے رجعت پسند پروپیگنڈا کو طاقت ملے گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ نام نہاد مذہبی گروہ

اپنے ان مطالبات کے ذریعے حکمرانوں کو ڈرانے دھمکانے میں کامیاب ہو جائیں اور وہ ان کے بتائے اصولوں پر چل پڑیں۔

جناب چیئرمین! یہ کانفرنس امن کے عظیم مقصد کو آگے بڑھانے کی ایک کوشش ہے۔ میں اس کانفرنس کے مندوبین اور خاص کر کے برطانیہ اور امریکہ کے مندوبین پر یہ بات واضح کرنا چاہوں گا کہ برطانوی اور امریکی حکومتیں جو مسلمانوں کو ان کے 'مذہبی عقائد' کی بنیاد پر متحد کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں ان کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ انہی طاقتوں کی سرپرستی کی وجہ سے ہے کہ مذہبی کٹرپن، جنونیت اور فاشسٹ رجحانات کو اہمیت اور طاقت مل رہی ہے اور یہ اسی سرپرستی کی وجہ سے ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ میرے لئے یہ بھی افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بہت سے مسلم ممالک سامراجی طاقتوں کی افواج کو اپنے (ملکوں کے) اڈے بیچ رہے ہیں۔ ہماری حکومتوں کی طرف سے کئے گئے ایسے معاہدوں کے کیا نتائج نکلیں گے اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اپنی سرزمین پر غیرملکی طاقتوں کی افواج کی موجودگی میں ہمارے ممالک بے بس ہوں گے اور ان کی قومی خودمختاری ختم ہو جائے گی۔ ہم میں سے بہت سوں کو یہ دیکھ کر شرم محسوس ہوتی ہے کہ ہمارے ممالک کی حکومتیں ہمارے قومی وقار اور عزت کو بیچ رہی ہیں۔

تو، خواتین و حضرات! ان تمام رجحانات کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ موجودہ حکومت ہمارے ملکی آئین کی حدود میں بھی مخالفت کو برداشت نہیں کرتی۔ وہ لوگ جو موجودہ حکومت کے مخالف ہیں ان کو اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کی پاداش میں جیلوں میں بند کیا جاتا ہے، چونکہ ان کے خیالات نام نہاد مذہبی گروہوں کے لئے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں صوبہ سرحد کے خان عبدالغفار خان اور بلوچستان

سے عبدالصمد خان اچکزئی کی مشہور مثالیں موجود ہیں۔ دونوں گذشتہ پانچ سال سے بغیر کسی مقدمے کے جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ جناب چیئرمین اور مندوبین ساتھیو، میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے برسوں تک برطانوی سامراجیت کے خلاف جنگ کی اور آزادی کے لئے ہماری جدوجہد میں صفِ اول کے رہنما تھے......اور غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھوں انہیں کیا کیا نہ مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ ہمارا ملک اپنی زندگی کے مشکل ترین دور سے گذر رہا ہے اور اس مرحلے پر ہمیں دنیا کے امن پسند لوگوں کی مدد اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ میں اس کانفرنس کے تمام مندوبین سے گذارش کرتا ہوں کہ مذہب کے نام پر جمع ہونے والی اندھیرے کی قوتوں کے خلاف جدوجہد میں ہماری مدد کریں۔

خواتین و حضرات! امن کی فتحیں جنگ کی فتحوں سے کم نہیں۔ یہ امن کانفرنس دنیا کی قوموں کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔ میں اپنے ملک کے امن پسند لوگوں کی طرف سے مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

امن زندہ باد!

جی۔ایم۔سیّد: سوانحی خاکہ

☆ 17 جنوری 1904 کو سن (ضلع کراچی) میں پیدا ہوئے۔ان کا سلسلہ نسب سید حیدر شاہ سنائی سے ہے جو خود سندھ کے ایک عظیم محب وطن ہو کر گذرے ہیں۔ سولہویں صدی میں سندھ پر حملہ کرنے والے ارغون حکمرانوں کے خلاف جدوجہد کرنے والے مخدوم بلاول سموں شہید کے وہ خلیفہ اول تھے۔یہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی کہ ایک سید ایک سماٹ نسل کے شخص کے خلیفہ بنے۔اس طرح غیر معمولی صلاحیتیں جی۔ایم۔سید ورثہ میں لے کر آئے۔

☆ پہلی نومبر 1905 کو ان کے والد سید محمد شاہ کو قتل کر دیا گیا۔

☆ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سن کے اسکول سے حاصل کی۔

☆ فروری 1920 میں لاڑکانہ میں منعقدہ خلافت کانفرنس میں شرکت کی۔

☆ مارچ 1920 میں سن میں خلافت کانفرنس منعقد کرائی۔

☆ اپریل 1920 میں شادی ہوئی۔

☆ دسمبر 1924 میں حیدر آباد میں ہونے والی 'سندھ تعلیمی کانفرنس' میں بھرپور حصہ لیا۔

☆ نومبر 1925 میں تعلقہ مانجھند لوکل بورڈ کے صدر منتخب ہوئے جہاں انہوں نے بہت سے ترقیاتی اور سماجی کام کئے جن میں عورتوں کی تعلیم کے لئے کوششیں خاص

طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

☆ جنوری 1926 میں کراچی ضلع لوکلبورڈ کے اسکول بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے۔

☆ تھیاسافیکل سوسائٹی کے ممبر بنے۔

☆ 1928 میں کراچی ضلع لوکلبورڈ کے پہلے وائس پریذیڈنٹ اور بعد میں پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔اس عرصہ کے دوران انہوں نے کراچی شہر اور ضلع کے دیہی علاقوں کی ترقی کے لئے انتھک کوششیں کیں جن کی چند مثالیں یہ ہیں: شہر کے مرکز کو مضافاتی گوٹھوں سے ملانے کے لئے سڑکیں تعمیر کروائیں۔ضلع لوکلبورڈ کی نئی عمارت تعمیر کروائی جو اب ریڈیو پاکستان عمارت کہلاتی ہے۔کراچی ضلع گوٹھ سُدھار ایسوسی ایشن، عورتوں کی فلاح و ترقی کی جماعت، مویشی داران کے تحفظ کے لئے ایسوسی ایشن، ماہی گیروں کے حقوق کی جماعت، آبادکاروں کے حقوق کی تنظیم اور کوآپریٹو انسٹیٹیوٹ جیسے اداروں کا قیام وغیرہ۔

☆ 1930 میں میرپورخاص میں ہاری کانفرنس بلائی اور جناب جمشید مہتا، جناب گوکلے، جناب جیٹھمل پرسرام، شیخ عبدالمجید سندھی اور جناب غلام قادر بلوچ کے ساتھ مل کر سندھ ہاری کمیٹی کی بنیاد رکھی۔

☆ 1930 کی دہائی کے شروع میں کانگریس کی ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد سے متاثر ہوکر کانگریس کے بہت قریب ہو گئے۔خود بھی کھدر کے کپڑے پہننے شروع کئے اور سن میں کھدر کا ایک کارخانہ بھی لگوایا۔

☆ 1931 میں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی یوتھ لیگ سے تعلق قائم ہوا۔

☆ 1930 کی دہائی کے دوران سندھ کی بمبئی (ممبئی) سے آزادی کی تحریک میں بھرپور کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں 1935 کے انڈین ایکٹ کے تحت

یکم اپریل 1936 کو بمبئی سے الگ سندھ کی صوبائی حیثیت بحال ہوئی۔

☆ 1930 میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سالانہ میلے کے موقعہ پر ادبی اور ثقافتی کانفرنس منعقد کرانے کا آغاز کیا۔

☆ 1934 میں شاہنواز بھٹو، اللہ بخش سومرو اور میراں محمد شاہ کے ساتھ مل کر سندھ پیپلز پارٹی بنائی۔

☆ 1936 میں حاجی عبداللہ ہارون اور اللہ بخش سومرو کے ساتھ سندھ اتحاد پارٹی کی بنیاد رکھی جس میں شاہنواز بھٹو بھی شامل ہوئے۔

☆ 1937 کے انتخابات میں سندھ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

☆ 1938 مسلم لیگ کراچی کانفرنس منعقد کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی سال مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔

☆ 1940 میں مختصر عرصے کے لئے تعلیم اور لیبر و انڈسٹریز کے وزیر بنے تو تعلیم، ادب اور مزدوروں کے لئے کئی اہم اقدامات کئے۔ سندھ یونیورسٹی کے قیام کے لئے کمیٹی قائم کی، سندھی ادبی بورڈ کا قیام عمل میں لائے، اسکولوں کے نصاب میں رقص و موسیقی کی تعلیم کو شامل کرایا اور مزدوروں کے لئے ڈیوٹی ٹائم مقرر کرنے اور آرام کی سہولتیں میسر کرنے کے قوانین بنوائے۔ ایک تجویز آئی کہ نصاب میں مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس پر جی۔ایم۔سید نے جائزہ کمیٹی مقرر کی جس نے رپورٹ دی کہ مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دینا درست نہیں۔ اس سے پہلے شاہ لطیف کلچرل بورڈ کے قیام میں کردار ادا کیا۔

☆ 1940 میں جواہر لال نہرو کی صدارت میں قائم شدہ ''انڈین نیشنل پلاننگ کمیشن'' کے ممبر رہے۔

☆ 1940 میں سندھ صوبائی مسلم لیگ کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ اسی سال

صوبائی انتظامی کمیٹی کے چیئر میں منتخب ہوئے۔

☆ 1941 میں آل انڈیا مسلم لیگ کی سینٹرل ایگزیکٹیو کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔

☆ 1942 میں مسلم لیگ سندھ کے صدر ہوئے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جی۔ایم۔سید کی شمولیت سے پہلے سندھ میں مسلم لیگ چند افراد پر مشتمل تھی جو بند کمروں میں قراردادیں پاس کیا کرتے تھے۔ یہ جی۔ایم۔سید ہی تھے جنہوں نے مسلم لیگ کو سندھ میں ایک عوامی جماعت بنایا۔ ساتھ ہی یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ جاگیرداروں سے بھری مسلم لیگ میں جی۔ایم۔سید کو مڈل کلاس کی آواز سمجھا جاتا تھا۔

☆ 1943 میں سندھ اسمبلی سے پاکستان کے حق میں قرارداد منظور کروائی۔

☆ 1946 میں محمد علی جناح سے اختلافات کی وجہ سے مسلم لیگ سے خارج ہوئے۔ اختلاف کی وجوہات: ایک تو جی۔ایم۔سید مڈل کلاس کی سیاست کرتے تھے جبکہ جناح صاحب جاگیرداروں کی حمایت کرتے تھے۔ دوسرے محمد علی جناح تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے جبکہ جی۔ایم۔سید کا موقف تھا کہ صوبائی معاملات میں سندھ مسلم لیگ خودمختار ہونی چاہیے۔

☆ 1946 میں عام انتخابات میں حصہ لیا مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلے میں۔ مسلم لیگ نے اس انتخاب کو 'اسلام اور کفر' کی جنگ کی طرح لڑا۔ سارے ہندوستان سے لوگوں نے آ کے ورک کیا۔ زبردست دھاندلی کر کے جی۔ایم۔سید کو ہرایا گیا۔ انہوں نے نتیجے کے خلاف پٹیشن داخل کی۔ الیکشن ٹربیونل نے پاکستان بننے کے بعد سید کے حق میں فیصلہ دیا اور مسلم لیگی امیدوار کو آئندہ الیکشن لڑنے کا نااہل قرار دیا۔

☆ 1948 میں خان عبدالغفار خان، عبدالصمد خان اچکزئی اور دوسرے روشن

خیال، سیکولر اور جمہوریت پسند رہنماؤں کے ساتھ مل کر ''پاکستان پیپلز آرگنائزیشن'' بنائی۔

☆ 1948 میں سندھ اسمبلی سے سندھی مسلمانوں کی زمینیں واپس کرانے کا بل پاس کرایا لیکن محمد علی جناح نے بطور گورنر جنرل اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

☆ مئی 1948 میں کراچی کو سندھ سے چھین کر مرکز کے حوالے کرنے کا منصوبہ سامنے آیا تو سید نے زبردست مخالفت کی جس کی بناء پر انہیں 18 جون 1948 کو گرفتار کیا گیا۔

☆ 1954 میں سندھ سمیت پاکستان کو بنانے والی وحدتوں بلوچستان، سرحد (پختونخوا) اور بہاولپور کی علیحدہ شناخت ختم کر کے اور پنجاب کے ساتھ ملا کر ون یونٹ بنانے کا اعلان کیا گیا تو دوسرے محب وطن سندھیوں کے ساتھ مل کر جی۔ایم۔سید نے مزاحمت کی تو 3 نومبر 1954 کو انہیں گرفتار کیا گیا اور سندھ اسمبلی سے زبردستی قرارداد پاس کروا کر اکتوبر 1955 سے مغربی پاکستان کا مصنوعی صوبہ بنایا گیا۔ جی۔ایم۔سید دسمبر 1957 تک قید میں رہے۔

☆ 7 اکتوبر 1958 کو ملک میں مارشل لاء لگایا گیا تو 10 اکتوبر 1958 کو سید کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ اس قید سے ان کو رہائی 8 سال بعد 12 فروری 1967 کو ملی۔

☆ 1967 میں انہوں نے بزمِ صوفیائے سندھ کے نام سے ایک غیر سیاسی تنظیم بنائی جس کے سیکریٹری جنرل رسول بخش پلیجو تھے۔ اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے انہوں نے شہروں اور گاؤں میں جا کر لوگوں میں شعور، آگہی، حب الوطنی، امن، رواداری اور بھائی چارے جیسے آدرشوں کی تبلیغ کی۔ حکومت وقت سے یہ بھی برداشت نہیں ہوا اور 22 جون 1967 کو انہیں گرفتار کر لیا۔ ان کو رہائی

26 جنوری 1969 کو تب ملی جب، ملک گیر تحریک سے مجبور ہو کر ایوب خان نے سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆ 1969 میں آزادی کے بعد انہوں نے صوبائی خودمختاری کے بارے میں عوامی لیگ کے چھ نکاتی پروگرام کی حمایت کی اور شیخ مجیب الرحمان کے اعزاز میں کراچی میں ایک زبردست استقبالیہ دیا۔

☆ 1970 کے انتخابات میں سید نے سندھ متحدہ محاذ کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا جس کا انتخابی اتحاد عوامی لیگ سے، تھا۔ ان انتخابات میں ان کی پارٹی کو شکست ہوئی۔

☆ مارچ 1971 میں بنگال پر فوجی چڑھائی کے وقت حکومت نے تمام قوم پرست، ترقی پسند اور محب وطن لیڈروں اور کارکنوں کو گرفتار کیا تو ان میں جی۔ایم۔سید بھی شامل تھے۔ اس قید سے ان کو رہائی تب ملی جب پاکستان ٹوٹ گیا، بنگلہ دیش وجود میں آیا اور باقی ماندہ پاکستان کی حکومت ذوالفقار علی بھٹو کو ملی۔

☆ 1970 کے انتخابات میں جی۔ایم۔سید کی جماعت کو شکست پیپلز پارٹی سے ملی تھی اور بنگلہ دیش کے بحران میں ذوالفقار علی بھٹو کے کردار کے وہ شدید مخالف تھے لیکن ''نئے پاکستان'' میں اقتدار میں آنے کے بعد بھٹو کو انہوں نے ایک کھلا خط لکھ کر تعاون کی پیشکش کی، بشرطیکہ وہ جمہوری اداروں کو مضبوط کریں اور سندھ کے قومی حقوق کی بحالی کے لئے اقدامات کریں۔

☆ 1972 میں سندھ اسمبلی نے سندھی زبان کے حق میں بل پاس کیا تو کراچی اور حیدرآباد میں لسانی فسادات کرائے گئے جبکہ مرکزی حکومت نے آرڈیننس کے ذریعے اس بل کو تبدیل کر دیا۔ اس پر سید نے سندھ کے عوام سے رجوع کرنے کے لئے سندھ کا دورہ شروع کیا تو اگست 1972 میں انہیں گرفتار

کر کے قید کر دیا گیا جہاں سے جنوری 1973 میں آزادی ملی۔

☆ جب سید نے دیکھا کہ انتخابات میں واضح اکثریت حاصل ہونے کے باوجود بنگالیوں کی نمائندہ جماعت عوامی لیگ کو اقتدار دینے کی بجائے ان پر فوجی چڑھائی کی اور پھر ''نئے پاکستان'' کے لیڈر ذوالفقار علی بھٹو نے بھی پرانی پالیسیاں جاری رکھیں تو انہوں نے آزاد، خودمختار اور خوشحال سندھ کا پروگرام دیا اور اس کے حصول کے لئے نئی جماعت ''جیئے سندھ محاذ'' بنائی۔

☆ 1973 کا آئین بنایا گیا تو جی۔ایم۔سید نے اور ان کی جماعت جیئے سندھ محاذ اور اس سے وابستہ جیئے سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے اسے ''قوموں کا قاتل'' آئین کہہ کر اسے رَد کیا اور اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس پر 28 اپریل 1973 کو انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ طویل نظر بندی 1987 تک چلی۔ جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگانے کے بعد بھٹو حکومت کے تمام اقدامات رَد کر دیئے، تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا لیکن سید کی نظر بندی کو ''پچھلی حکومت کا ورثہ'' قرار دے کر جاری رکھا۔

☆ رہائی پانے کے بعد انہوں نے سندھ کے عوام سے رابطے کے لئے اپر سندھ کا دورہ شروع کیا تو دسمبر 1987 میں انہیں لاڑکانہ سے گرفتار کیا گیا اور 1988 میں رہا کیا گیا۔

☆ اکتوبر 1989 میں انہوں نے عوامی رابطے کا اپنا نامکمل دورہ مکمل کرنے کی سکھر سے شروعات کی تو مشہورِ زمانہ جھنڈا کیس بنا کر انہیں پھر نظر بند کر دیا گیا۔ یہ بینظیر بھٹو کی حکومت تھی۔

☆ 1990 میں عبوری حکومت نے انہیں رہا کیا۔

☆ 1991 میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد بدلے ہوئے عالمی منظرنامے

میں 17 جنوری 1992 کو جی۔ایم۔سید کی سالگرہ کا روایتی جلسہ نشتر پارک کراچی میں منعقد ہوا جہاں انہوں نے اقوامِ متحدہ کی تشکیلِ نو کا ایک خاکہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ دوسرے دن وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف کے معاونِ خصوصی چودھری نثار علی خان نے پریس کانفرنس کرتے ہوئے جی۔ایم۔سید کو غدار قرار دے کر قید کر دیا۔ ان پر غداری کا مقدمہ قائم تو ہوا لیکن کبھی چلا نہیں۔ سید کی یہ قید ان کی زندگی کی آخری قید ثابت ہوئی۔ نواز شریف کی 'حریفِ خاص' بینظیر بھٹو نے بھی اس قید کو 'مقدس فریضہ' سمجھتے ہوئے جاری رکھا لیکن جنیوا میں اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے بارے میں کمیشن کے اجلاس میں پاکستان کے وزیر قانون اقبال حیدر نے بھی جی۔ایم۔سید کی قید سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں کوئی سیاسی قیدی نہیں۔

☆ 25 اپریل 1995 کو کراچی کے جناح اسپتال کے ایک وارڈ میں سپاہیوں کی سنگینوں کے سائے میں ایک پُرآشوب دور کا خاتمہ ہوا اور اس غیر معمولی شخصیت نے قید و بند سے بھری زندگی سے رہائی حاصل کی۔

☆ جی۔ایم۔سید نے تاریخ، سیاست، مذہب، ادب، کلچر، عدالتی نظام، بین الاقوامی معاملات اور دوسرے موضوعات پر پچاس سے زیادہ کتابیں لکھیں اور ہزاروں مقالے، خطبے اور تقاریر لکھیں اور پڑھیں۔

جی ۔ایم سید کے خلاف الزامات کی حقیقت

5 ستمبر 2015 کے 'جنگ' میں سینئر صحافی اور اینکر پرسن حامد میر کا کالم 'عبدالحفیظ پیرزادہ کا آخری ارمان' کے عنوان سے چھپا ہے۔اپنے کالم میں عبدالحفیظ پیرزادہ کی تعریف کرتے ہوئے حامد میر نے سندھ کے قومی رہنما محترم جی ایم سید پر انتہائی سنگین اور بے بنیاد الزامات لگائے ہیں؛ ایسے الزامات جو پاکستانی ریاست اپنے تمام تر اختیارات اور وسائل کے باوجود اور بھٹو سمیت ان کے بدترین دشمن اپنی تمام تر ذھانتوں کے ہوتے ہوئے بھی سید پر نہیں لگا سکے۔ حامد میر صاحب فرماتے ہیں کہ جی ۔ایم ۔سید نے اپنے امیدواروں کو جتوانے کے لئے آئی ۔ایس ۔آئی سے پیسے لیے۔

ان الزامات کی حقیقت کی طرف میں بعد میں آتا ہوں لیکن چونکہ جناب حامد میر نے یہ ساری باتیں جناب پیرزادہ کے حوالے سے کی ہیں تو پہلے میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کالم نویس کی پیرزادہ صاحب کے بارے میں معلومات ناقص ہے۔ وہ لکھتے ہیں

کہ ''پاکستان واپسی کے بعد انہوں (پیرزادہ) نے سیاست چھوڑ دی'' جو کہ درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 85-1984 میں لندن میں سندھی، بلوچ، پختون فرنٹ کے قیام کے بعد اس کے سیکریٹری جنرل کی حیثیت میں پاکستان آ کر تنظیم کو آرگنائیز کرنے کی غرض سے عبدالحفیظ پیرزادہ نے پورے ملک کے دورے کیے۔ بعد میں ان کے فرنٹ کی دوسری قیادت کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے تو وہ کچھ عرصے کیلئے خاموش ہو گئے۔ 1989 میں میر غوث بخش بزنجو کے انتقال کے بعد ان کی جماعت پاکستان نیشنل پارٹی کو نئے سرے سے منظم کیا گیا تو جناب پیرزادہ اس میں شامل ہوئے اور پارٹی کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے جبکہ صدر بزنجو صاحب کے صاحبزادے بیزن بزنجو تھے۔

جناب حامد میر کا مذکورہ کالم میں کہنا ہے کہ جی۔ایم۔سید نے 1990 کے الیکشن میں اپنے امیدواروں کیلئے غلام اسحاق خان اوا اسد درانی کے ذریعے حکومت سے پیسے لیے۔ اتنی بڑی شخصیت پر اتنا بڑا الزام لگاتے ہوئے کالم نویس نے کوئی ثبوت نہیں پیش کیا۔ پوری دنیا یہ جانتی ہے، اور مانتی ہے، کہ جی۔ایم۔سید نے زندگی میں کوئی کام خفیہ طریقے سے نہیں کیا۔ وہ جو کچھ بھی کہتے اور کرتے تھے وہ اعلانیہ طور پر بابانگِ دھل کرتے تھے۔ اگر جنرل ضیاالحق ان سے ملنے آئے تو وہ ملاقات بھی دن دھاڑے صحافی حضرات کی موجودگی میں ہوئی جبکہ وہ جماعت (پیپلز پارٹی) جس کو حامد میر اسٹبلشمنٹ کا مخالف بنا کر پیش کر رہے ہیں اس کے لیڈر کس طرح چھپ چھپ کر فوجی ڈکٹیٹر سے ملتے تھے، باخبر صحافی ہونے کی ناطے حامد میر ضرور ان سے واقف ہونگے نہیں تو سابق بیوروکریٹ سعید مہدی کا انٹرویو سن / دیکھ لیں۔ جی۔ایم۔سید نے تو دھلی میں راجیو گاندھی سے اپنی ملاقات اور اس میں کی گئی باتیں بھی واپس آ کر خود ہی دنیا کو بتا دیں۔ نہ صرف سندھ بلکہ پورے برِ صغیر میں نیشنلزم، سیکیولرزم اور جمہوریت کیلئے جدوجہد کی علامت کے طور پر مشہور جی۔ایم۔سید جیسی شخصیت پر انتہائی سنگین لیکن نہایت سطحی قسم کے الزامات صرف سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر لگائے گئے ہیں جو تاریخی اور واقعاتی طور پر درست بھی نہیں ہیں۔

صورتحال کو بہتر طور پر سمجھنے کیلئے زیرِ نظر کالم کے دو ٹکڑوں کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ ابتدا ہی میں کہا گیا ہے کہ ''عبدالحفیظ پیرزادہ اپنی یادداشتوں پر مشتمل کتاب مکمل کر چکے تھے۔ کتاب پبلشر کے حوالے کی تھی کہ محترمہ بینظیر بھٹو کو راولپنڈی میں شہید کر دیا گیا۔ پیرزادہ صاحب

نے اپنی کتاب کی اشاعت کو ملتوی کر دیا کیونکہ اس کتاب میں انہوں نے محترمہ بینظیر بھٹو پر خاصی تنقید کی تھی اور سنگین الزامات لگائے تھے۔ پیرزادہ صاحب کا خیال تھا کہ یہ کتاب محترمہ بینظیر بھٹو کی زندگی میں شایع ہوتی تو بہتر ہوتا تاکہ وہ اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کا دفاع کر سکتیں''۔ آگے چل کر پیرزادہ صاحب کے انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ''1990 میں اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان نے انہیں بلایا اور اسلامی جمہوری اتحاد میں شمولیت کی دعوت دی۔ پیرزادہ صاحب نے صدر کو بتایا کہ وہ سیاسیت چھوڑ چکے ہیں۔ صدر غلام اسحاق خان نے ان سے کہا کہ آپ کے سندھی قوم پرست رہنما جی ایم سید سے بڑے قریبی تعلقات ہیں، آپ انہیں آئی جے آئی کی حمایت کے لئے راضی کریں ہم ان کے امیدواروں کی مالی مدد کریں گے۔ عبدالحفیظ پیرزادہ نے غلام اسحاق خان کا پیغام جی۔ایم سید کو پہنچایا۔ جی۔ایم سید پیپلز پارٹی کی نفرت میں آئی جے آئی سے تعاون پر راضی ہو گئے۔ جی۔ایم۔سید نے چھ انتخابی امیدواروں کے لئے رقم طلب کی۔ کچھ دنوں بعد آئی۔ایس آئی۔کے سربراہ اسد درانی کراچی میں عبدالحفیظ پیرزادہ کے گھر آئے اور بتایا کہ صدر صاحب نے جی۔ایم۔سید کے چھ امیدواروں کے لئے پانچ لاکھ فی کس کے حساب سے 30 لاکھ روپے منظور کئے ہیں۔ اسد درانی نے پانچ پانچ لاکھ کے چھ چیک پیرزادہ کی موجودگی میں اعجاز جتوئی کے حوالے کر دئے۔''

کتنی عجیب بات ہے کہ جناب عبدالحفیظ پیرزادہ نے اپنی کتاب کی اشاعت کو تو ایکدم اس لئے روک دیا کہ اس میں بینظیر بھٹو پر تنقید تھی اور وہ اس دنیا میں نہیں رہی تھیں لیکن اسی عبدالحفیظ پیرزادہ نے جی۔ایم۔سید کے انتقال کے بیس برس بعد ان پر انتہائی سنگین الزامات لگانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی اور حامد میر جیسے سینئر صحافی نے بغیر تصدیق کئے ان الزامات کو جوں کا توں چھاپ دیا اپنے اس فتوے کے ساتھ کہ پیرزادہ صاحب نے آئی ایس آئی سے پیسے تو لئے لیکن اپنے لئے نہیں۔

لیکن تاریخی حقیقتیں جناب حامد میر کے بیان کردہ واقعات کو غلط ثابت کرتی ہیں اور اس بنیاد کو ہی جھٹلاتی ہیں جس پر یہ ساری کہانی کھڑی کی گئی ہے۔ 1990 میں عبدالحفیظ پیرزادہ سیاست چھوڑ نہیں چکے تھے بلکہ بڑے پر جوش طریقے سے سیاست میں موجود تھے۔ نہ صرف اس وقت وہ ایک اہم جماعت پاکستان نیشنل پارٹی کے سیکریٹری جنرل تھے بلکہ ان ہی 1990 کے

انتخابات میں وہ قومی اسمبلی کے حلقہ دادو III (محال کوہستان) سے امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد 1991 میں جیکب آباد ضلع کے گڑھی خیرو حلقے سے سندھ اسمبلی کیلئے ہونے والے ضمنی انتخاب میں بھی جناب پیرزادہ امیدوار تھے (اس کا ذکر 10 ستمبر کے جنگ میں حسن مجتبیٰ کے کالم میں بھی آچکا ہے)۔ یہ انتخاب اس وقت کے وزیراعلیٰ جام صادق علی کے آھنی ھتکنڈوں کی وجہ سے پورے پاکستان میں مشہور ہوا تھا۔

دوسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ حامد میر صاحب خود لکھتے ہیں کہ آئی ایس آئی کے سربراہ نے چیک حفیظ پیرزادہ کے گھر پر اعجاز جتوئی کے حوالے کر دئے۔ تو اس سے یہ کیسے اخذ کیا گیا کہ پیسے جی۔ایم۔سید نے لئے۔ اس بات کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر حفیظ پیرزادہ کے جی۔ایم۔سید سے 'قریبی تعلقات' تھے اور غلام اسحاق خان نے رابطہ بھی ان ہی سے کیا تو پھر چیک اعجاز جتوئی کے حوالے کیوں کیے گئے۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اعجاز جتوئی کا ذکر بھی ان کے انتقال کے 18 سال بعد کیا گیا ہے جب وہ ''اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کا دفاع'' نہیں کر سکتے۔

حاصل مقصد یہ ہے کہ جناب حامد میر کے کالم اور اس میں دئے گئے جناب پیرزادہ کے انٹرویو سے یہ بات کہیں بھی اور کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتی کہ جی۔ایم۔سید نے چیک لئے جبکہ اسی کالم سے اتنی بات ثابت ہو چکی ہے کہ آئی ایس آئی کے سربراہ چیک لے کر پیرزادہ صاحب کے گھر پہنچے تھے۔ یہ بات بھی تاریخی رکارڈ سے ثابت ہو چکی ہے کہ عبدالحفیظ پیرزادہ نے 1990 کے انتخابات میں حصہ لیا تھا جبکہ یہ بات تو خود حامد میر صاحب نے لکھی ہے کہ اصغر خان کیس میں 'عبدالحفیظ پیرزادہ کا نام بھی ان سیاستدانوں کے ساتھ آیا جنہوں نے آئی ایس آئی سے رقوم وصول کی تھیں'۔ تو ان سارے حقائق کی روشنی میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جناب پیرزادہ نے رقم اپنے لئے نہیں بلکہ جی۔ایم۔سید کے لئے تھی؟



حقائق جھٹلانے کی بیماری
اور تاریخی شعور کی کمی

5اور 17 ستمبر 2015 کو حامد میر کے لکھے دو کالم جنگ اخبار میں شائع ہوئے جن میں جناب جی ایم سید پر آئی ایس آئی سے پیسے لینے کے الزامات لگائے گئے۔ان کے جواب میں یکم نومبر کو شائع ہوئے میرے جواب کے جواب میں حامد میر کا ایک اور طویل کالم 12 نومبر کو شائع ہوا ہے۔ میں اس لحاظ سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ میں ہمیشہ سیاست میں اور سماج میں مکالمے کا حامی رہا ہوں۔ ساتھ ہی میں اُمید کرتا ہوں کہ حامد میر اور جنگ اخبار صحتمند صحافت کے معیار اور اقدار پر چلتے ہوئے میرے نقطہ نگاہ کو بھی قارئین تک پہنچنے سے نہیں روکیں گے۔

حامد میر نے اپنے تازہ کالم کی ابتدا اس جملے سے کی ہے کہ ''حقائق کو جھٹلانا ایک قومی بیماری بن چکی ہے، تاریخی شعور کی کمی کے باعث ہم اپنے آپ کو تاریخ کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتے بلکہ اپنے اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر اپنی اپنی مرضی کی تاریخ تراشنے کی کوشش کرتے

ہیں'' ان کے یہ الفاظ بہت اہمیت کے حامل ہیں لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ کس پر صادر آتے ہیں۔

عبدالحفیظ پیرزادہ کے جس انٹرویو کو بنیاد بنا کر حامد میر نے اپنا کالم لکھا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ سابق صدر غلام اسحاق نے پیرزادہ کو آئی جے آئی کا ساتھ دینے کی پیشکش کی لیکن چونکہ حفیظ پیرزادہ سیاست سے رٹائرڈ ہو چکے تھے اس لئے انہیں جناب جی۔ایم۔سید سے رابطہ کرنے کو کہا گیا۔ میں نے اپنے جواب میں تاریخی حقائق اور رکارڈ کے ذریعے ثابت کیا تھا کہ 1990 کے انتخابات کے وقت عبدالحفیظ پیرزادہ سیاست سے رٹائرڈ نہیں ہوئے تھے بلکہ اس کے بعد تک بہت سرگرم رہے تھے جس سے پوری کہانی کی بنیاد ہی غلط ثابت ہوتی تھی۔ حامد میر ان حقائق کو تسلیم کرنے اور اپنی غلطی ماننے کی بجائے اپنے تازہ کالم میں ذاتیات پر اتر آئے ہیں اور میرے اور جناب جی۔ایم۔سید کے خلاف مزید ایسی باتیں لکھی ہیں جو نہ صرف کردار کشی کے زمرے میں آتی ہیں بلکہ حقائق کے بھی خلاف ہیں۔

حقائق کے ادراک کے سلسلے میں حامد میر کا یہ عالم ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ '' جی ایم سید نے 1972 میں جیئے سندھ قومی محاذ بنایا'' جبکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ جیئے سندھ قومی محاذ سائیں جی ایم سید کے انتقال کے بعد 1995ء میں بنایا گیا تھا۔ تاریخ سے ان کی جانکاری اتنی ہے کہ اللہ بخش سومرو کو سندھ کا وزیر اعلیٰ لکھا ہے جبکہ اللہ بخش سندھ کے وزیر اعظم تھے۔ مزید لکھتے ہیں کہ '' جب برطانوی حکومت نے سندھ میں حروں کے خلاف آپریشن کیا اور ان پر بمباری کی تو سندھ کے وزیر اعلیٰ اللہ بخش نے احتجاج کیا جس پر انہیں گورنر کے ذریعے برطرف کرادیا گیا۔'' سنی سنائی باتوں پر قلم اُٹھانے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اللہ بخش سومرو کو اس لیے برطرف کیا گیا کہ انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک کی حمایت کرتے ہوئے انگریزوں کے دیئے ہوئے خطابات واپس کر دیئے جس پر برطانوی حکومت ناراض ہوئی اور ان کو برطرف کردیا۔ جہاں تک حروں کا تعلق ہے تو حروں کے حمایتی تو اللہ بخش سومرو پر حکومت کا ساتھ دینے کا الزام لگاتے ہیں۔

تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کی تاریخ تراشنے کی کوشش کرتے ہوئے حامد میر لکھتے ہیں۔ '' اس وقت سندھ اسمبلی میں مسلم لیگ کی اکثریت تھی اور سندھ مسلم لیگ کے سربراہ

ایوب کھوڑو تھے لیکن گورنر نے سر غلام حسین ہدایت اللہ کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ جی ایم سید نے قائداعظم کی مرضی کے خلاف سر غلام حسین ہدایت اللہ اور ایوب کھوڑو کو اپنا تعاون فراہم کیا اور ہندو انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ساتھ مل کر نئی حکومت بنائی جس نے حروں کے خلاف سخت کارروائی جاری رکھنے کی یقین دہانی کرائی۔'' جی ایم سید دشمنی میں حامد میر اتنے بوکھلا گئے ہیں کہ ان کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر اکثریتی پارٹی (مسلم لیگ) کے سربراہ ایوب کھوڑو کو نظر انداز کر کے غلام حسین ہدایت اللہ کو حکومت بنانے کی دعوت دی گئی تو پھر جی ایم سید نے سر غلام حسین ہدایت اللہ اور ایوب کھوڑو دونوں کی حمایت کیسے کی؟ جواب یہ ہے کہ سندھ مسلم لیگ کے سربراہ ایوب کھوڑو صاحب خود سر غلام حسین ہدایت اللہ کی حکومت میں شامل ہو گئے اور غلام حسین ہدایت اللہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ جی ایم سید نے غلام حسین ہدایت اللہ کو حکومت بنانے کی دعوت دینے کے عمل کو غلط کہا لیکن جب وہ سب آپس میں مل گئے تو جی ایم سید کیا کرتے۔ ایسی صورتحال میں جناح صاحب کی کیا مرضی تھی جس کے خلاف (بقول حامد میر) جی ایم سید نے سر غلام حسین ہدایت اللہ اور ایوب کھوڑو کو اپنا تعاون پیش کیا اس کی وضاحت حامد میر نہیں کر سکے۔ کیا جناح صاحب مسلم لیگ کی حکومت بننے کے خلاف تھے؟ دوسری بات یہ کہ اگر جی ایم سید نے سر غلام حسین ہدایت اللہ اور ایوب کھوڑو کو اپنا تعاون فراہم کیا تو پھر ایک ہی وقت انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ساتھ مل کر نئی حکومت کیسے بنائی۔ مزے کی بات کہ ہندو انڈیپنڈنٹ پارٹی نام کی کسی تنظیم کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

موصوف لکھتے ہیں کہ، ''3 جنوری 1946ء کو جی ایم سید کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔ یہ جی ایم سید کے سیاسی زوال کا آغاز تھا۔'' اگر وہ تاریخی حقائق سے واقف ہوتے تو یہ فقرا صادر نہیں کرتے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسلم لیگ سے علیحدگی کے بعد 1946ء کے انتخابات میں سائیں جی ایم سید نے مسلم لیگی اُمیدوار قاضی اکبر کا مقابلہ کیا۔ جناح صاحب کی اپیل پر سارے ہندوستان سے ان کے ورکر سید کے خلاف ورک کرنے کیلئے آئے۔ اس کے باوجود ان کو جیت کیلئے دھاندلی کرنی پڑی جس کے خلاف سید کی اپیل پر الیکشن ٹریبونل نے پاکستان بننے کے بعد اپنا فیصلہ دیتے ہوئے جی ایم سید کو کامیاب قرار دیا اور مسلم لیگ کے اُمیدوار قاضی اکبر کو انتخابات کیلئے نااہل قرار دے دیا۔

جی ایم سید کی سیاست سے ایک نقص یہ بھی نکالا گیا ہے کہ ''ان کی جماعت ان کی زندگی میں ہی ٹوٹ گئی تھی'' اب 'سینئر صحافی' کو یہ کون یاد دلائے کہ 'بانی پاکستان' محمد علی جناح کی زندگی میں ہی مسلم لیگ ٹوٹ گئی اور 'مفکر پاکستان' علامہ محمد اقبال نے سر محمد شفیع کے ساتھ مل کر دوسری مسلم لیگ بنالی اور آج تک مسلم لیگ کے ٹوٹنے کا عمل جاری ہے۔ پیپلز پارٹی سے ٹوٹ کر دس مختلف پارٹیاں بن گئیں۔ حتیٰ کہ ذوالفقار علی بھٹو کی سگی اولاد بینظیر بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو نے الگ الگ پیپلز پارٹی بناڈالی۔ تو ان سب کے لئے حامد میر کا کیا خیال ہے؟

اپنی مرضی کی تاریخ تراشنے اور جی ایم سید کے خلاف اپنا بغض نکالنے کی سب سے بڑی کوشش کرتے ہوئے حامد میر لکھتے ہیں کہ ''اسٹیبلشمنٹ نے جی ایم سید کو تو معاف کر دیا لیکن پیپلز پارٹی کو معاف نہیں کیا۔'' حقائق کو جھٹلانے کی اس سے بڑی اور دلیرانہ مثال کیا ہوسکتی ہے۔ پاکستان میں اپنی 48 سالہ زندگی میں سے جی ایم سید کو اسٹیبلشمنٹ نے تقریباً 30 سال قید و بند میں رکھا جبکہ پیپلز پارٹی کو آج تک 5 مرتبہ مسند اقتدار پر بٹھایا گیا ہے۔ سید کو قید میں رکھنے والے محمد علی جناح سے لے کر بینظیر بھٹو تک پاکستان کے تمام سویلین اور فوجی حکمران شامل رہے۔ ان کی قید کے 30 برسوں میں سے پہلے فوجی حکمران ایوب خان کے دور کے وہ 8 سال بھی شامل ہیں جو 8 سال ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کے چہیتے وزیر رہے۔ دوسرے فوجی حکمران جنرل یحییٰ خان کے دور میں بھی جی ایم سید جیل میں رہے جبکہ پیپلز پارٹی کے لیڈران کے نائب وزیراعظم رہے۔ خود ذوالفقار علی بھٹو کی پانچ سالہ حکومت کا تقریبا تمام عرصہ سید نے قید میں گذارا۔ اور تو اور جنرل ضیاء الحق، جن کے طعنے حامد میر سمیت بہت سے لوگ سید کو دیتے ہیں، ان کے گیارہ سالہ دور میں سے 9 سال سید قید میں رہے۔ اس میں وہ 3 سال بھی شامل ہیں جب بینظیر بھٹو جنرل ضیا کی اجازت سے یورپ کی ٹھنڈی ہوائیں کھا رہی تھیں۔ جب بینظیر بھٹو لاہور میں بڑی ریلیاں نکال رہی تھیں سید اس وقت بھی نظر بند تھے۔ اسٹیبلشمنٹ کی جی ایم سید کے ساتھ 'مہربانیوں' کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب جنرل ضیا کی حکومت میں محمود ہارون وزیر داخلہ تھے تو ان کے بھائی سعید ہارون کا انتقال ہوا۔ سائیں جی ایم سید نے پرانے خاندانی تعلقات کی وجہ سے تعزیت کی خاطر ہارونوں کے گھر جانے کیلئے پیرول پر رہائی کی درخواست وزارت داخلہ کو بھیجی لیکن اسٹیبلشمنٹ سے منظوری نہ ملنے پر محمود ہارون نے وہ درخواست رد کر دی۔ یہاں تک کہ جناب جی

ایم سید جب بیماری کی حالت میں ہسپتال میں زندگی کی آخری گھڑیاں گذار رہے تھے اس وقت بھی ریاست کے بندوق باز ان کے اوپر پہرہ دے رہے تھے اور اس وقت کسی اور کی نہیں پیپلز پارٹی کی لیڈر بینظیر بھٹو کی حکومت تھی

حامد میر اپنے تین کالموں میں مسلسل جنرل ضیا اور غلام اسحاق خان سے جی ایم سید کے پرانے تعلقات اور بینظیر بھٹو کی دشمنی کو دہراتے رہے ہیں لیکن انہوں نے ان پرانے تعلقات کی تفصیل نہیں بتائی ۔ جنرل ضیاء کی جی ایم سید سے دو مختصر ملاقاتیں ہوئیں ۔ایک مرتبہ جنرل صاحب سید کی عیادت کرنے اسپتال میں پہنچے اور دوسری مرتبہ ایک مشترکہ دوست کی شادی کی دعوت میں ملاقات ہوئی ۔ دونوں ملاقاتوں میں سید کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا ۔ پھر سید تو جنرل کے قیدی تھے ۔اگر صیاد قیدی سے ملنے آئے تو قیدی کیا کرسکتا ہے ۔ حامد میر لکھتے ہیں کہ ''غلام اسحاق خان دراصل جنرل ضیاء کی سوچ کا ایک سویلین چہرہ تھے'' بہتر ہوتا اگر وہ یہ بھی لکھ دیتے کہ اسی غلام اسحاق خان کو بینظیر بھٹو نے اپنے ایم آر ڈی کے ساتھی نوابزادہ نصراللہ کے مقابلے میں پارٹی کے ووٹ دے کر صدر منتخب کرایا۔اب قارئین خود فیصلہ کریں کہ اسٹیبلشمنٹ جی ایم سید اور پیپلز پارٹی میں سے کس کی دوست اور کس کی مخالف رہی ہے ۔

ایک اور حقائق سے نابلدی پر مبنی نہایت سطحی قسم کا الزام حامد میر نے یہ لگایا ہے کہ ''وہ (جی ایم سید) اپنے مریدوں کے ووٹوں سے 1937ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے'' میں یہاں حامد میر سے پوچھتا ہوں کہ انہیں یہ پتہ ہے کہ 1937ء میں سندھ اسمبلی کی اس نشت کا جغرافیہ کیا تھا جہاں سے جی ایم سید رکن منتخب ہوئے؟ کیا انہیں یہ معلوم ہے کہ جی ایم سید کے مرید کون تھے اور وہ کہاں رہتے تھے؟ اور کیا انہیں یہ علم ہے کہ اس وقت کے قانون کے لحاظ سے کون ووٹ دینے کا اہل تھا اور اس کسوٹی پر جی ایم سید کے کونسے اور کتنے مرید پورے اترتے تھے اور جی ایم سید نے کتنے ووٹوں سے کامیابی حاصل کی تھی؟ اگر ان سوالوں کے جوابات ان کے پاس ہیں تو قارئین کو بتائیں ورنہ ایسے بے بنیاد اور لغو الزامات لگانے سے باز رہیں ۔

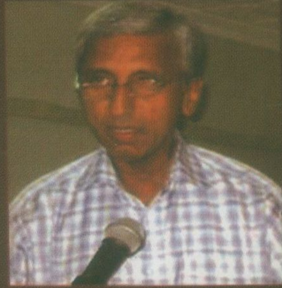
جی ایم سید کے پائے جیسی شخصیت کے خلاف بے بنیاد اور لاعلمی اور تعصب پر مبنی الزامات لگاتے وقت تو حامد میر بڑے ہشاش بشاش نظر آتے ہیں لیکن اگر ان کے الزامات کا تاریخی حقائق کی روشنی میں دلیل دلائل سے جواب دیا جائے تو وہ 'کمزور صحافی' بن جاتے ہیں جیسے

اپنے اس تازہ کالم میں وہ فرماتے ہیں کہ ”انہیں (عبدالحفیظ پیرزادہ کو) ہتک عزت کا نوٹس دینا یا اخبار میں جواب دینا بڑے دل گردے کی بات تھی لیکن ہم جیسے کمزور صحافیوں کی ڈانٹ ڈپٹ آج کل سب سے آسان کام ہے۔“ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے عبدالحفیظ پیرزادہ سے کہیں بڑے اور طاقتور لیڈروں ذوالفقار علی بھٹو اور بینظیر بھٹو کے بارے میں بھی تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور پیپلز پارٹی کے مرکزی لیڈروں کی موجودگی میں تنقیدی گفتگو بھی کی ہے لیکن وہ ساری تنقید ان کی سیاست کے بارے میں ہوتی ہے اور وہ تاریخی واقعات اور ناقابل تردید حقائق پر مبنی ہوتی ہے۔ میں نے کبھی ان کی (یا کسی اور کی) ذاتی شخصیت کے بارے میں بات نہیں کی، نہ ہی اپنی طرف سے ان پر کوئی الزام لگایا۔

اگر حامد میر صرف عبدالحفیظ پیرزادہ کے انٹرویو کا حوالہ دیتے (جیسا انہوں نے دعویٰ کیا ہے) تو پھر مجھے انہیں جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کا حوالہ دیتے ہوئے وہ جی ایم سید کی سیاست اور کردار کے بارے میں اپنے فتوے بھی جاری کرتے گئے ہیں جو سلسلہ ان کے پہلے کالم سے لیکر اس حالیہ (تیسرے) کالم تک جاری ہے۔ تو پھر جواب ملنے پر انہیں اتنی تکلیف کیوں محسوس ہوتی ہے۔ باقی میری ذات کے بارے میں انہوں نے جو کچھ ریمارکس دیئے ہیں ان کے بارے میں فی الحال میں کوئی جواب نہیں دے رہا۔

آخری لیکن سب سے اہم بات جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا اور جو عبدالحفیظ پیرزادہ اور حامد میر کی جانب سے شروع کی گئی اس کہانی کی بنیاد ہے کہ چونکہ 1990ء کے انتخابات کے وقت پیرزادہ صاحب خود سیاست سے ریٹائر ہو چکے تھے اس لئے غلام اسحاق خان نے ان کے ذریعے جی ایم سید سے رابطہ کیا۔ یہی نقطہ میرے جواب کی بنیاد تھا۔ لیکن افسوس کہ اپنے تازہ جوابی کالم میں حامد میر نے دنیا بھر کی دوسری صحیح اور غلط باتیں تو میرے اور محترم جی ایم سید کے بارے میں لکھ ڈالیں لیکن اس بنیادی نقطے کے بارے میں میرے دلائل کا نہ جواب دیا نہ ذکر کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے پاس اس کا جواب نہیں ہے۔





دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تمام قوتیں یکجا ہو کر بھی سید کو شکست نہیں دے سکیں۔ یہ تمام حکمران اپنی پوری طاقت کے ہوتے ہوئے بھی سید سے ڈرتے تھے جو کبھی کبھی تو بالکل یک وتنہا اُن کے سامنے سینہ سپر ہوتا تھا محمد علی جناح اپنی مقبولیت کے عروج کے وقت بھی جی ایم سید سے اتنا خوفزدہ تھا کہ ان کا سامنا کرنے کیلیئے اُس کو پورے ہندوستان سے رضا کار بلانے پڑے اس کے باوجود سندھ کے اس محبّ وطن سپوت کو نا ہرا سکا تو پاکستان کا اقتدار ملتے ہی جو پہلے نیک کام اس نے کیئے ان میں جی ایم سید کو قید کرنا بھی شامل تھا۔ 1970 میں ذوالفقار علی بھٹو سندھ (اور پنجاب) کے انتخابی افق پر چھا گیا جی ایم سید اپنی نشست بھی ہار گیئے بھٹو پاکستان کا میکاولین بادشاہ بن گیا خود کو تیسری دنیا اور اسلامی دنیا کا لیڈر سمجھتا تھا لیکن جی ایم سید سے اتنا خوفزدہ تھا کہ اپنے اقتدار کا ایک دن بھی سید کا آزاد حیثیت میں مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا جنرل ضیاء اپنی تمام تر فوجی طاقت اور رفقاء کی رفاقت کے باوجود جی ایم سید کو آزاد کرنے سے ڈرتا تھا۔

عبدالخالق جونیجو